طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۵۱

یومِ تشکیلِ پاکستان کی یاد میں

صحیح انتخاب اس وقت ہوسکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہوسکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہوسکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجیے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے، نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

نیازآگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ
آٹھ آنے (پاکستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)

مرتب
محمد یونس

بدل اشتراک
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
" غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۴ | اگست ۱۹۵۱ء | نمبر ۸

فہرستِ مضامین

یاد دہانی!	۳	الہام	۵۱-۶۴
لمعات	۵-۲۳	(محترم پرویز صاحب)	
حسنِ نظر (نظم)	۲۴	باب المراسلات	۶۵-۷۸
(محترم اسد ملتانی صاحب)		۱۔ اسلامی تاریخ	
سلیم کے نام	۲۵-۳۵	۲۔ ملی تقاریب	
(محترم پرویز صاحب)		۳۔ قرآن فہمی کا طریق	
سازش	۳۶-۵۰		

(ادبی پریس کراچی)

یاد میں!

اگست ۱۹۴۷ء

اُن لاکھوں بے گناہ، مظلوم انسانوں کی جو بہار، گڑھ مکتیسر، دہلی، پنجاب، اجمیر، بھرت پور، الور، پٹیالہ، کپورتھلہ اور دیگر اَن گنت مقامات پر انسان نما درندوں کی ہوسِ خون آشامی اور سبعیت و بربریت کے پنجۂ خونین کا اس سفاکی اور بیدردی سے شکار ہوئے جس کی نظیر چشمِ فلک نے اس سے پیشتر کہیں نہیں دیکھی تھی۔

اُن خانماں خراب، سوختہ بخت، تباہ حال، متاع بردہ، فلاکت زدہ، ستم رسیدہ، بے سروسامان قافلوں کی جن کی تمام متاعِ حیات اور اثاث کائنات لٹ گئی اور جو زندگی کا بوجھ اپنی نحیف و زار پیٹھ پر لادے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن جنھیں سردی سے بچنے کے لئے الاؤ اور سر چھپانے کے لئے پھوس کا چھپر تک نصیب نہیں۔

اُن عفت مآب خواتین کی جن کی رداؤں پر چاند اور تاروں کے سوا کبھی کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑی تھی، لیکن جنھیں عریاں بدن، سربازار اس طرح پھرایا گیا کہ اس پر انسانیت روتی اور حیا ماتم کرتی تھی۔

اُن معصوم بچیوں کی جو قوم کی عزت و ناموس کی سرمایہ دار تھیں لیکن جنھیں انسانی پیکروں میں چھپے ہوئے بہائم و اجادل اس طرح اچک کر لے گئے کہ ان کا آج تک سراغ نہ مل سکا۔

اُن پیکرِ مظلومیت ماؤں کی جن کے سامنے ان کے جگر گوشوں کو کرپانوں کی نوک پر اچھالا گیا لیکن جنھیں اس قیامت خیز سانحہ ہوشربا کو دیکھ کر آہ تک کی بھی اجازت نہ دی گئی۔

اُن خاموش نگاہوں کی جنھوں نے زندگی کی تمام بہاروں کو لٹتے اور امیدوں کے سب آسروں کو ٹوٹتے دیکھا لیکن جن کے عنابی آنسوؤں کو سرِ مژگاں تڑپ کر آجانے کے بعد بھی اذنِ چکیدن نہ ملا۔

ہاں. یاد میں مصائب و آلام کی ان تمام قیامتوں کی جنھیں فرزندانِ توحید پر اس جرم کی پاداش میں توڑا گیا کہ انھوں نے اپنا رشتۂ ایمان دامنِ محمدِ عربی سے کیوں وابستہ کر رکھا ہے؟

لیکن

یہ یاد ایک بیوہ کے بَین نہیں جس کا مقصد بقایا عمر محض ماتم گساری اور نوحہ خوانی میں گذار دینا ہوتا ہے۔ یہ یاد ہے اس حقیقتِ کبریٰ کو سامنے لانے کیلئے کہ

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

اگر آج ان کے ہاتھوں سے تمہیں زخم لگا ہے تو گھبرانے کی بات نہیں ان کے سینے بھی تمہارے تیروں سے چھلنی ہو چکے ہیں، یہ تو زمانے کی گردش دولابی ہے، آج اگر تم اپنے اعمال کے ہاتھوں نیچے گر گئے ہو تو کل تم اوپر آسکتے ہو۔ اس لئے ہمت کیوں ہارتے ہو؟

لہٰذا وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ (۳/۱۳۸)

اگر تم خدائے حی و قیوم کے ابدی قانون کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہو تو دنیا میں سب سے بڑی بلندی تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے اس لئے گھبرانے اور خوف کھانے کی وجہ نہیں۔

مسلم ہستی اسینہ را از آرزو آباد دار

ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

[طلوع اسلام جنوری ۱۹۴۸ء]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ عاشورا (دسویں محرم) کا روزہ کس تقریب کی یاد میں رکھا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس روز بنی اسرائیل نے فرعون کی محکومیت سے آزادی حاصل کی تھی اس لئے یہ دن ایسا ہے جس کی یاد قائم رکھنا ضروری ہے۔

جس مسلمان کا یہ عالم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے یوم آزادی کی یاد کو قائم رکھنا بھی اپنے لئے فریضہ سمجھتا ہے، وہ خود اپنی آزادی کے دن کی یاد کو کس طرح بھلا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں، وہ دن جب وہ محکومیت کے عذاب سے نجات حاصل کریں، سب سے بڑے جشن و مسرت کا دن ہوتا ہے۔ ایسا جشن جس سے دلوں میں شگفتگی، روح میں بشاشت، نگاہوں میں تازگی اور ذہنوں میں جلا پیدا ہو جائے۔ جس سے اس قوم کے افراد کے اندر شرفِ انسانیت کا احساس بیدار ہو جائے۔ جس سے وہ یہ کہنے میں ہزار فخر محسوس کریں کہ ہم دنیا میں کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتے۔ ہماری تقدیریں ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ہم اپنے شب و روز کے آپ مالک ہیں۔ ہم اپنے حال کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارتے ہیں۔ ہم اپنے مستقبل کے سانچے اپنے پیمانوں کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ ہم خوب و ناخوب کا فیصلہ اپنے اندازوں سے کرتے ہیں۔ ہم اشیائے کائنات کی اقدار اپنے معیاروں کے مطابق متعین کرتے ہیں۔ ہم اپنے فیصلوں میں کسی کے چینِ جبیں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہم اپنے ارادوں پر کسی کے اندازِ ابرو کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ ہم اپنی نیند سوتے ہیں اور اپنی نیند جاگتے ہیں۔

خوشا بخت ہے وہ قوم جسے یہ کچھ کہنے کی سعادت نصیب ہو جائے، اور خوشتر از ہزار عید ہے وہ دن جو اس کے لئے اس آزادی کا پیغام لیکر آئے۔

سرزمینِ پاکستان کے رہنے والوں کے لئے ۱۵ اگست کا دن، اسی جشنِ آزادی کا دن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہمایوں بخت ساعتیں جو آج سے چار سال پہلے ان کے لئے پیامِ حریت لائیں اور مسعود و میمون ہے وہ ملت جو اس نویدِ حیات بخش و نشیدِ نشاط آور کی مورد و مہبط بنی۔

ہم اس مسعود و مبارک ساعت کی یاد میں، تمام باشندگانِ پاکستان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ اور مملکتِ پاکستان کے لئے دست بدعا ہیں کہ

الٰہی! بختِ تو بیدار بادا　　　ترا دولت ہمیشہ یار بادا

لیکن پیکِ آزادی جہاں سرور و انبساط کی ایک دنیائے سبک سیر اپنے جلو میں لاتا ہے، وہاں فرائض اور ذمہ داریوں کا کوہِ گراں بار

بھی، اس قوم کے سر پر مسلط کر دیتا ہے۔ فطرت کی عنایاتِ خسروانہ بے مزد و معاوضہ نہیں ملتیں۔ جسقدر کوئی متاع عزیز ہوتی ہے، فطرت اسی نسبت سے اس کی قیمت بھی وصول کرتی ہے۔ قرآن کریم، جو نوعِ انسانی کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرانے کا انقلابی پروگرام اپنے ساتھ لایا ہے، اس حقیقتِ کبریٰ کو ایسے جامع اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے جس پر چشمِ بصیرت وجد کرنے لگ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اذا جاء نصر اللہ والفتح — جب اللہ کی طرف سے فتح و نصرت پیامِ حیات آور لائے۔

ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا۔ — اور لوگ فوج در فوج نظامِ خداوندی کے بہشتِ جاوداں میں داخل ہونے لگیں۔

جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو۔ . . . . .

اس "تو" کے بعد قرآن نے ایسا پروگرام دیا ہے جس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔

فرمایا۔ تو

فسبح بحمد ربك۔ واستغفرہ۔ انہ کان توابا۔

سبح کے معنی ہیں ادائیگی فریضہ یا حصولِ مقصد کی جدوجہد میں پوری قوت و توانائی سے سرگرداں پھرنا۔ جدوجہد، سعی و عمل تا بحد استطاعت۔ تگ و تاز تا بحد امکان۔ (Utmost struggle) یہیں سے "تسبیح" کے معنی سمجھ میں آجائیں گے جو اب دانے گننے کے کام آتی ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ کائنات میں ہر شے کے دو پہلو ہیں۔ ایک جمالیاتی (Aesthetic) یا (Appreciative) پہلو اور دوسرا افادی (Utilitarian)۔ افادی پہلو پرورش کا ذریعہ بنتا ہے اور جمالیاتی پہلو جذباتِ لطیفہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ . . . . . افادی پہلو کو قرآن کی اصطلاح میں ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے لیکر آہستہ آہستہ بتدریج تکمیل تک پہنچانا۔ جیسے پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں گہر آبدار بن جاتا ہے۔ اللہ کی صفتِ ربی اس کے قانونِ ربوبیت کی مظہر ہوتی ہے۔ اور جب یہی صفتِ خداوندی انسانوں کی اس جماعت میں مرتسم ہوتی ہے جو اپنے معاشرے کی بنیاد اس کے قانون پر رکھتے ہیں، تو وہ جماعت تمام افرادِ انسانیہ کے فطری جوہروں کی کامل نشوونما کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔ اسی نسبت سے اس جماعت کو "ربانیون" (رب والوں کی جماعت) کہا جاتا ہے۔

ربوبیت کے مقابلہ میں دوسرا گوشہ جمالیاتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں حمدیت (Appreciation) کہتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت ربوبیت ہی کا ایک گوشہ ہوتا ہے لیکن افادیت اور جمالیت کے تقابل کے لحاظ سے اسے جداگانہ طور پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا "بحمد ربک" کا صحیح مفہوم ہوا اس نظام کا قیام جس میں حمدیت اور ربوبیت کے دونوں گوشے حدود اللہ کے اندر ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔ یعنی اس حد تک اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ

جب خدا کی فتح و نصرت آئے اور تم غیر خداوندی قوتوں کے پنجۂ استبداد سے نکل کر آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشا ہو تو اس وقت یہ سمجھ کر اطمینان سے نہ بیٹھ جانا کہ اب ہم منزل پر پہنچ گئے۔ اب کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس وقت یہ سمجھنا کہ کام کا وقت ہی اب شروع

ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنی انتہائی قوتیں اس جدوجہد میں صرف کر دینا کہ اس نظام کے تابع بسنے والے تمام انسانوں کی صحیح صحیح پرورش ہو اور ان کی تمام صلاحیتیں اپنے اوجِ کمال تک پہنچ جائیں۔ فسبح بحمد ربك۔ یہ ہے حمدیت اور ربوبیت کے مالک خدا کی تسبیح۔ اور یہ ہے فریضۂ زندگی اس قوم کا جسے اللہ آزادی کی نعمت سے سرفراز کرے۔

اس کے بعد دو ٹکڑے اور آتے ہیں۔ واستغفرہ۔ انہ کان توابا۔ بقائے صحت کے دو طریقے ہیں۔ ایک حفظ ما تقدم (Preventive) اور دوسرا ازالۂ مرض (Curative) حفظ ماتقدم کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے جسم انسانی ان عناصر کے حملوں سے محفوظ رہے جو خرابیٔ صحت کا موجب بنتے ہیں۔ انھیں حفاظتی تدابیر کہا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام مغفرت ہے (مغفر اُس لوہے کی ٹوپی، خُود، کو کہتے ہیں جسے دشمن کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے اوڑھا جاتا ہے)۔ استغفار کے معنی ہیں حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا۔ واستغفرہ کا مطلب ہے قانونِ خداوندی کے ذریعے حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا۔

ازالۂ مرض (Curative) کے معنی یہ ہیں کہ انسانی جسم میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں انھیں دور کر کے، صحت کو پھر سے اس کی اصلی حالت پر لایا جائے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں توبہ کہتے ہیں۔ تاب کے معنی ہیں اس مقام پر لوٹ کر آنا جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا۔ انہ کان توابا کا مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا کے قانون میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کو ان عناصر کے حملوں سے حفاظت میں رکھتا ہے جو اس کے لئے وجۂ تخریب بن سکتے ہیں، وہاں اس میں یہ استعداد بھی ہے کہ اگر کسی سبب سے خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان خرابیوں کا ازالہ کر کے انسانی معاشرہ کو پھر سے صحیح حالت پر لے آئے۔

اب اس پوری سورہ کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اس قابل ہو جاؤ کہ اپنے معاشرہ کو قانونِ خداوندی کے مطابق تشکیل کر سکو (کہ مسلمان کے نزدیک آزادی سے یہی مراد ہے۔ اس سے کم یا مختلف اور کسی چیز کا نام آزادی نہیں) تو اس کے بعد اس مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہو جاؤ جس کے لئے یہ آزادی ملی ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی فطری صلاحیتوں کی کامل نشوونما (ربوبیت) کا پورا پورا انتظام ہو، جس میں جسمانی پرورش اور شرفِ انسانیت کے تمام تقاضے شامل ہیں۔ اس نظام ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام تدابیر اختیار کی جائیں جن سے یہ نظام خارجی معاندانہ حملوں سے ہر طرح محفوظ رہے اور اس کے ساتھ ہی داخلی خرابیوں اور کوتاہیوں کا بھی ازالہ ہوتا رہے۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح۔ ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً۔ فسبح بحمد ربك واستغفرہ۔ انہ کان توابا۔

یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن نے اس قوم کے لئے تجویز کیا ہے جو "خدا کے نام پر" آزادی حاصل کرتی ہے۔ مسلمانانِ پاکستان نے اپنی آزادی خدا ہی کے نام پر حاصل کی تھی۔ تحریک پاکستان کے دوران میں ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ ہماری آزادی کا مفہوم اس آزادی سے یکسر مختلف ہے جس کے لئے ہندو کوشاں ہیں۔ ہم اس لئے آزاد ہونا چاہتے ہیں کہ ہم کلمۃ اللہ کو بلند کر سکیں۔ دنیا میں اسلام کا نام روشن کر سکیں۔ اپنی مملکت میں اپنے خدا کا قانون نافذ کر سکیں۔ اپنی زندگیاں خدائی سانچوں میں ڈھالنے کے قابل بن سکیں۔ ایک دفعہ

پھر اس درخشندہ اور تابناک دور کو واپس لاسکیں جسے آسمان کی آنکھ نے ایک بار دیکھا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ ہم نے یہی کہہ کر آزادی حاصل کی تھی اور اب بھی جس وقت ضرورت پڑتی ہے، ہم انہی وعادی کا اعادہ کرتے اور انہی عزائم کو دہراتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم نے خدا کے نام پر آزادی حاصل کی ہے تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ حصولِ آزادی کے بعد آج تک ہم نے ان مقاصد کے حصول میں کیا کچھ کیا ہے جو خدا کے نام پر آزادی حاصل کرنے والوں کے لئے خدائی پروگرام نے متعین کر رکھے ہیں۔ اس مختصری صحبت میں، اس طویل وعریض موضوع پر استیعابی گفتگو کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں پر طائرانہ نگاہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دستور سازی کسی مملکت کی تشکیل کے بعد سب سے پہلا اور بنیادی کام اس مملکت کا دستور (Constitution) مرتب کرنا ہوتا ہے کیونکہ دستور کے بغیر وہ سرزمین بے آئین رہتی ہے اور دستور ہی ان تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے جو اس مملکت کی اساس ہوتے ہیں۔ اوروں کے لئے یہ مرحلہ دشوار ہو تو ہو، ایک اسلامی مملکت کے لئے اس باب میں چنداں دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ اسلئے کہ قرآن نے وہ اصول خود ہی متعین کر رکھے ہیں جو ایک اسلامی مملکت کے دستور کے لئے بنیادی اصول Basic Principles قرار پاتے ہیں۔ اس مملکت کے واضعینِ دستور کے لئے فقط ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنے کا کام باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں وضع دستور کے لئے کمیٹیاں تو ۱۹۴۷ء ہی میں بٹھادی گئی تھیں لیکن "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کی رپورٹ تین سال کے بعد (سالِ گذشتہ) شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کی حقیقت کیا تھی اس کا اندازہ اسی سے لگ سکتا ہے کہ سارے ملک میں اس کی مخالفت ہوئی اور بالآخر حکومت کو مملکت کے افراد اور اداروں سے سفارشات طلب کرنی پڑیں۔ اس سلسلہ میں اوروں نے جو کچھ کیا وہ تو الگ رہا۔ ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے ایک جامع مسودہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولِ دستور خالص قرآن کی روشنی میں مرتب کرکے مجلس دستور ساز کے پاس، اواخر جنوری ۱۹۵۱ء میں بھیجدیا تھا (یہ مسودات طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۵۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ لوگوں نے انھیں پمفلٹ کی شکل میں چھپوا کر تقسیم کیا ہے)۔ اس کے بعد مجلس مذکور کی طرف سے ادارہ طلوع اسلام کو کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کا مختصر سا اجلاس پھر ہوا تھا جس میں غالباً ان مسودات پر غور کیا جانا تھا جو ملک کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ ہم مجلس دستور ساز کی خدمت میں باادب گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں کسی لمبی چوڑی بحث و تمحیص اور کنونشن کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن تمام مسلمانوں کے نزدیک آئین اسلام کا بنیادی ضابطہ ہے اس لئے جو دستور خالص قرآن کے اصولوں کے مطابق وضع کیا جائیگا اس پر کسی مسلمان کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ قرآن کے بعد (یا بعد) جو کچھ بھی ہے اس میں فرقہ وارانہ اختلاف ہوگا اور یقیناً ہوگا۔ اس لئے ان بنیادوں پر کوئی بھی ایسا دستور مرتب نہیں کیا جاسکتا جو سب مسلمانوں کے نزدیک متفقہ علیہ ہو سکے۔ لہٰذا فیصلہ کرنے کی بات صرف اس قدر ہے کہ پاکستان کا دستور دین کی بنیادوں پر ہوگا یا دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح عام سیاسی مصالح کے مطابق۔ اگر فیصلہ یہ ہو (اور ہمارا خیال ہے کہ قرارداد مقاصد کا مقصد یہی تھا) کہ یہ دستور دین کے اصولوں کے مطابق ہوگا تو اس باب میں ایک ہی راہ فلاح اور کشاد کی ہے۔ اور وہ راہ وہی ہے جس کی طرف طلوع اسلام کے مسودات میں راہ نمائی کی گئی ہے۔

یعنی مختلف شاخوں سے صرف نظر کرکے، جڑ کو پکڑ لیا جائے۔ دین کی جڑ، قرآن کریم ہے۔ لہٰذا پاکستان کا دستور قرآنی اصولوں کے مطابق مرتب کرلیا جائے۔ اس میں صرف تھوڑی سی جرأت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے اربابِ حل وعقد نے اتنی سی جرأت کرلی تو اس کے بعد ملت کی گاڑی پھر اس پٹڑی پر چل پڑیگی جس پر وہ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) میں تھی۔ یہی وہ پٹڑی (صراطِ مستقیم) ہے جو ملت اسلامیہ کو امامتِ اقوام کی شاداب منزل تک لے جانے والی ہے اور جس میں نوعِ انسانی کی ربوبیت کا راز پوشیدہ ہے۔ لہٰذا "فسبح بحمد ربک" کے پروگرام کی پہلی کڑی، قرآنی اصولوں کے مطابق، دستور کی ترتیب وتدوین ہے۔

پناہ گزینوں کا مسئلہ

تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا مسئلہ "پناہ گزینوں"[۱] کی بحالی کا تھا۔ جس طرح ایک بزرگِ خاندان (Head of the Family) کا اولیں فریضہ افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا ہے، اسی طرح مملکت کا کام، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا ہے۔ اگر کسی گھر کے بعض افراد مکان کے اندر عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہے ہوں اور اپنی جیسے دوسرے افراد، باہر گلی میں پریشان حال پھر رہے ہوں، تو اس خاندان کے بزرگ کے متعلق جو کچھ اندازہ کیا جائیگا ظاہر ہے۔ اس باب میں اربابِ بست وکشاد اپنی جسقدر مشکلات بھی بیان کریں، ان کے بعد یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ہماری اصل مشکل اس لئے نہیں کہ ہمارے پاس ان خانماں برباد، تباہ شدہ حصۂ آبادی کیلئے ضروریاتِ زندگی کا سامان نہیں۔ ہماری مشکل کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اس کی تقسیم غلط ہوئی ہے۔ اسی قسم کے مسئلہ سے خود نبی اکرمؐ کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اس کا حل صحیح تقسیم کے ذریعے کرلیا۔ اور نہایت کامیاب طریقے سے کرلیا۔ مکہ سے آنے والوں اور مدینہ میں رہنے والوں میں مواخات، اور جو کچھ میسر آیا اس کی برابر برابر تقسیم، بس یہی اس مشکل کا حل تھا۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں قحط پڑا ہے[۲] تو اردگرد کی تمام آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہوگئی تھی۔ ابن سعد کی تحقیق کے مطابق ان "پناہ گزینوں" کی آبادی کم از کم پچاس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ شاید یہ تعداد آج کچھ زیادہ نہ دکھائی دے لیکن اس زمانے کو سامنے رکھئے جب مدینہ خود ایک مختصر سی بستی تھی اور وسائلِ نقل وحرکت بھی بیحد محدود تھے۔ اس وقت اس کا صحیح اندازہ ہوگا کہ یہ مسئلہ (Problem) کس قدر پریشان کن اور صبر آزما تھا۔ اس دشوار گزار اور جانکاہ مرحلہ کو کس طرح طے کیا گیا؟ اسی صحیح تقسیم کے ذریعے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ جو کچھ کسی کے پاس تھا اور جو کچھ کسی کو میسر آتا،

---

[۱] اس اصطلاح کو استعمال کرتے وقت ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ برابر کے بھائیوں میں سے ایک کو مالک اور دوسرے کو پناہ گزین کہنا عدل ومساوات سے چشم پوشی اور حقیقت بینی سے عمداً اجتناب کی ایسی مثال ہے جو شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے۔ لیکن چونکہ ہمارے ان خانماں برباد بھائیوں کا تعارف انہی الفاظ سے ہو رہا ہے اس لئے ہم نے بھی بادلِ ناخواستہ یہی الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ کیا کریں۔ بنتی نہیں ہے بادہ ومساغر کہے بغیر۔

[۲] اسے تاریخ میں عام الرماد کہکر پکارا گیا ہے کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین اور اس کی تمام شادابیاں، جل کر راکھ (رماد) ہو چکی تھیں۔

سب ایک جگہ جمع ہو جاتا اور ضروریات کی شدت اور اہمیت کی نسبت سے سب میں تقسیم کر دیا جاتا۔ خود امیر المومنین حضرت عمرؓ کی یہ حالت تھی کہ مسلسل جو کی روٹی کھانے سے انھیں سوءِ ہضم کی شکایت ہو گئی، اور گھی کی جگہ زیتون کے تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقائے کار نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ بہتر غذا استعمال کریں۔ آپ کی صحت کی ملت کو ازبس ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے تو انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست[1]

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہؓ) کو بلایا اور کہا کہ اور مسلمانوں کے بچے روٹی کے ٹکڑے کیلئے ترس رہے ہیں اور عمر کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اس کا کوئی جواب (Explanation) تمہارے پاس ہے؟ انھوں نے کہا کہ بچے کو صبح کے وقت (عام بچوں کے ساتھ) جو کھجوروں کی گٹھلیاں ملی تھیں، اس نے ان کے عوض ایک بدو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس "میوہ خوری" کی! ورنہ عمرؓ کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ، اور اتنا ہی مل رہا ہے، جو کچھ اور جتنا قحط زدہ مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔ یہ تھا احتیاط کا عالم اور اس کے ساتھ ذمہ داری کے احساس کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق

> قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ عشاء کی نماز پڑھا کر اپنے مکان میں داخل ہوتے اور آخر شب تک برابر نماز پڑھتے رہتے۔ پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے (تاکہ تمام لوگوں کی خبر گیری کریں)۔ ایک رات میں نے انھیں یہ دعا کرتے سنا کہ اے اللہ! امتِ محمدیہ کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر۔ (طبقات ابن سعد)

وہ لوگوں کے غم میں اس قدر نڈھال تھے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے بیان کے مطابق، صحابہؓ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے۔ اس تمام دوران میں حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکوں یا بیویوں میں سے کسی کے گھر کچھ نہیں چکھا۔ جو ہیں گھنٹے میں ایک مرتبہ، انہی "پناہ گزینوں" کے درمیان بیٹھ کر، وہی کچھ کھا لیتے جو انھیں ملتا۔ حتیٰ کہ (حضرت صفیہ بنت ابی عبیدؓ کی روایت کے مطابق) اس تمام زمانے میں آپ اپنی بیوی کے قریب تک بھی نہیں گئے حتیٰ کہ لوگ خوشحال نہیں ہو گئے۔

لہٰذا ہماری دشواری یہ نہیں کہ ہمارے پاس ان "پناہ گزینوں" کے لئے ضروریات زندگی کی کمی ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے لیکن اس کی تقسیم غلط ہوئی ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے　　زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جب تک یہ تقسیم صحیح نہیں ہوتی "پناہ گزینوں" کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور تقسیم صحیح ہو نہیں سکتی جب تک یہ احساس پیدا نہ ہو جائے کہ

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یہی وہ احساسِ امانت تھا جس کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو حکم دیا تھا کہ ان کا مکان فروخت کر دیا جائے اور

---

[1] اس تلمیح کے لئے علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرار و رموز ملاحظہ فرمائیے۔

انھوں نے جو کچھ بیت المال سے لیا ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ اس لئے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو کچھ مسلمانوں کے مال سے لیا ہے اس کے معاوضے میں ان کا کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ بہتر ہو کہ یہ حساب یہیں چکا دیا جائے تاکہ مجھے خدا کے حضور اس کا حساب نہ دینا پڑے"۔

یہ ہوتا ہے اسلامی مملکت کے ارباب حل وعقد کا احساسِ ذمہ داری! اسی لئے جب حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ! تو جواب ملا تھا کہ اگر آپ مسلمانوں کے مال میں سے ایک درہم بھی ناحق خرچ کریں گے تو آپ بادشاہ ہیں، ورنہ خلیفہ۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ اپنے گذارے کے لئے دو درہم روزانہ اور سردی گرمی دو جوڑے کپڑے بیت المال سے لیا کرتے تھے اور اس پر بھی ہمیشہ زرد رُو رہا کرتے تھے کہ کہیں یہ زیادتی تو نہیں؟

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آج بھی دو درہم روزانہ کے وظیفے اور دو کپڑوں میں گذارہ کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب قوم پر اس قسم کی مصیبت آن پڑے جس سے آج پاکستان دوچار ہے تو اس کا علاج انہی تدابیر سے ہو سکتا ہے جنھیں حضرت عمرؓ نے اختیار کیا تھا اور جن کی رو سے جو سب سے بڑا تھا اس کا متاعِ ملی میں سب سے کم حصہ تھا۔ کہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

مسلمانانِ ہندوستان

پناہ گزینوں کے ساتھ ہی خیال مسلمانانِ ہند کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

اس لئے کہ یہ دونوں درحقیقت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں اور ایک ہی مرثیہ کے دو بند ہیں۔ یہ ابتدا کے لئے ہے وہ انتہا کے لئے۔ ان بچاروں کی حالت ایسی ہے کہ اسے بیان کرنے کیلئے جب قلم اٹھایا جائے تو سینے میں دل لرز جاتا ہے۔

تحریک پاکستان کے دوران میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے متعلق ہماری دلیل یہ ہوتی تھی کہ پاکستان میں بھی اقلیتیں موجود ہوں گی اس لئے ان کا وجود ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا ضامن ہوگا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ہماری یہ دلیل لاطائل ہو کر رہ گئی۔ اب وہاں کے مسلمانوں کی حالت وہ ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ والمستضعفین من الرجال والولدان۔ وہاں کے مرد، عورتیں اور بچے جنھیں طرح طرح کے مظالم سے کچل کر ناتواں بنا دیا گیا ہے۔ الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا۔ رو رو کر پکارتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! کوئی ایسا سامان پیدا کر دے کہ ہم اس ملک سے نکل سکیں جس کے رہنے والوں نے ظلم وستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا۔ اور ان کی نگاہیں بصد حسرت ویاس آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور انتہائی ناامیدی کے عالم میں کہتی ہیں کہ ہمارا یہاں کوئی یار و مددگار نہیں اس لئے اے چارہ سازِ بے چارگاں! تو کسی کو ہمارا چارہ ساز بنا کر بھیجدے اور کسی کو ہماری یاوری پر آمادہ کر دے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم یہاں سسک سسک کر مر جائیں گے۔ یہی تھے وہ مسلمان جن کے لئے اللہ نے ان کے ہمسایہ مسلمانوں کو جنھیں اس نے حکومت وملکت سے نوازا تھا، کہا تھا کہ مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے ان مظلوم ومقہور بھائیوں کی فریاد پر لبیک کہتے ہوئے شمشیر بکف اٹھ نہیں کھڑے ہوتے؟

آج ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ یہی ہو چکی ہے۔ ان کے لئے وہاں زندگی حرام کر دی گئی ہے اور باہر نکلنے کی راہیں مسدود ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ہمارا ان کیلئے شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہونا تو ایک طرف، ان کیلئے دعائے خیر تک بھی ہماری زبانوں پر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ اسلامی جماعت کی بارگاہِ امارت سے تو ان سوختہ سامانوں کے حق میں یہ فتویٰ بھی صادر ہو چکا ہے کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات بھی ناجائز ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ

موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

حضرت امیر جماعت ایدہ اللہ بنصرہ نے اپنی مسند رشادت سے بیک جنبش قلم فیصلہ صادر فرما دیا کہ

نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو ٹوٹ نہیں سکتا لیکن زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہو اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنا پر درخواست دی جا سکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔

آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہئے[1]۔ (ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۵۱ء ملخصاً)

یعنی یہ حضرات جو تمام تحریکِ پاکستان کے دوران میں، پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور قائدینِ تحریک کو گالیاں دیتے رہے، وہ تو آج

---

[1] جب یہ الفاظ ہماری نظر سے گذرے ہیں تو ہم پر کیا گذری، اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن اس کے بعد خود ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ تحریک، جس تحریک (مرزائیت) کے نقش قدم پر جا رہی ہے، اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ انہوں نے پہلے "نسلی مسلمانوں" اور "اصلی مسلمانوں" (یعنی اسلامی جماعت کے ممبروں اور غیر ممبروں) میں وہی تخصیص پیدا کی تھی جو اس سے پہلے مرزائیوں نے اپنوں اور غیر مرزائیوں میں پیدا کی تھی۔ آج کل چونکہ (مرزائیوں کی طرح) اسلامی جماعت والوں کے سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کے خلاف کھلا زہر نہ اگلا جائے اس لئے یہ کچھ وقت کے لئے ان کے ناوکِ ستم سے مامون ہیں۔ (اگرچہ دشنۂ پنہاں کی زد سے محفوظ نہیں)۔ لیکن ہندی مسلمان چونکہ بے بس ہیں اور ان سے ان کے مفاد وابستہ نہیں، اس لئے ان سے شادی بیاہ کے تعلقات ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔ ان حضرات کو ذرا برسرِ اقتدار آنے دیجئے۔ پھر پاکستان میں بھی وہی نسلی اور اصلی مسلمان کی تفریق شروع ہو جائے گی۔ دراصل مذہبی فرقوں کے وجود کا راز ہی اس میں ہوتا ہے کہ اپنے فرقے کے لوگوں کے اندر عصبیت پیدا کی جائے اور اپنے سے باہر والوں کو غیر قرار دے کر ان کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے جائیں۔

چونکہ اس جماعت کے اغراض ہی معاشی اور سیاسی ہیں اس لئے ان کا مسلک، سیاسی مصالح کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق نسلی اور اصلی کی تفریق کا سوال پیش پیش تھا۔ تقسیم کے بعد جب حکومت کی کرسیوں کا تصور انھیں بے چین کرنے لگا تو جہاں تک پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق تھا، یہ تفریق سمٹ کر پیچھے چلی گئی۔ اب پاکستان کے مسلمان ایسے سچے اور پکے مسلمان بن گئے کہ انھوں نے قرار دادِ مقاصد پاس کرا کر مملکت کو بھی مسلمان کر دیا تاکہ صالحین کی یہ جماعت اس "اسلامی مملکت" کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اب وہی جذبۂ نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف ابھر آیا۔ لیکن عین اس وقت جب اس جماعت کی پاکستانی شاخ کے امیر ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ ارشاد فرما رہے تھے، اس کی ہندوستانی شاخ کے امیر (ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی) اپنی رامپور کی تقریر میں یہ فرما رہے تھے کہ

اسلام جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں، مسلمانوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں بلکہ وہ آپ کا بھی ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا۔ اگر مسلمان اس کو اپنا مخصوص مذہب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔

یعنی اِدھر یہ شدت اور غلو ہے کہ نسلی مسلمان، مسلمان ہی نہیں اور ہندی مسلمان کے ساتھ شادی بیاہ تک بھی جائز نہیں۔ اور اُدھر یہ مداہنت کہ اسلام ایک برہمو سماجی یا کبیر پنتھی قسم کا مت ہے جو ہندوؤں کا بھی ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس قابل ہیں کہ حکومتِ پاکستان کی مسندیں ان کے حوالے کردی جائیں اور جن مسلمانوں کے سر صدقے پاکستان وجود میں آیا ہے، جو ابھی تک وہاں کے ہندوؤں کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ جن پر گوشۂ عافیت تنگ ہو چکا ہے۔ ان سے پاکستانی مسلمانوں کا رشتہ بیاہ بھی ناجائز قرار پاگیا! ہم تکبر و جہالت کے ان برخود ائمہ سے (جنھیں دعوٰے یہ ہے کہ وہ خاص مزاج شناس رسالتمآبؐ واقعہ ہوئے ہیں اور جن کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہجرت کسے کہتے ہیں اور اس کے احوال و ظروف کیا ہوتے ہیں) اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اسوقت ہندوستان کا مسلمان سخت ناتواں اور بے چارہ ہے اسلئے تمہارے تیر و سنان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن ڈرو اسوقت سے جب اس کمزور و ناتواں مسلمان کا ہاتھ ہوگا اور تمہارا گریبان اور کوئی پوچھنے والا پوچھے گا کہ

بای ذنب قتلت

بالآخر کس جرم کی پاداش میں انھیں اس طرح قتل کیا گیا تھا؟ سوچو کہ اسوقت تمہارا کیا جواب ہوگا؟ لیکن یہ سوچے تو وہ جسے اس امر کا یقین ہو کہ ایک دن کسی پوچھنے والے کے سامنے جانا ہے!

بہرحال، انھیں چھوڑیئے اور اس مسئلہ کو سنجیدگی سے سوچیے کہ ہندی مسلمانوں کی طرف سے جو ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برا ہونے کی تدبیر کیا ہے؟ اس حقیقت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تو ایک دو نسلوں کے بعد ان کا وجود بہ حیثیت مسلمان باقی نہیں رہے گا۔ جو آسانی سے ہندوؤں میں جذب ہونے پر آمادہ ہوں گے انھیں ہندو بنا لیا جائے گا اور اس طرح وہاں اچھوتوں کا ایک جدید دور پیدا کر لیا جائیگا۔ جن میں ذرا سختی اور صلابت ہوگی انھیں ختم کر دیا جائے گا۔ اس باب میں ہندوؤں کے عزائم بالکل کھلے کھلے اور بے نقاب ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان مظلوم مسلمانوں کو وہاں سے نکال لیا جائے۔ ہمارے ہاں خدا کی دی ہوئی زمین بڑی وسیع ہے۔ اس کے اندر دفن شدہ خزانے بھی بہت ہیں۔ وہاں کا تین چار کروڑ مسلمان آسانی سے اس زمین میں بسایا جا سکتا ہے۔ پھر تبادلہ آبادی کی رو سے مشرقی بنگال میں قریب ڈیڑھ کروڑ ہندو بھی جگہ خالی کریں گے۔ اس لئے جہاں تک جگہ کا تعلق ہے ہمارے ہاں گنجائش کافی ہے۔ اناج بھی ہمارے ہاں اتنا ہے جس سے اس زائد آبادی کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ کمی پڑ جائے تو اور اناج اگایا جا سکتا ہے۔ وہاں کا کاشتکار طبقہ یہاں آسانی سے کھپ سکتا ہے۔ باقی رہا مزدور طبقہ تو ان کے لئے کارخانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس باب میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ اس وقت ان طریقوں سے دولت کمانے میں مصروف ہے جنھیں قرآن نے میسرہ سے تعبیر کیا ہے (یعنی بغیر محنت و مشقت کے دولت کما لینا)۔ آپ کسی بڑے سرمایہ دار کے متعلق پوچھئے کہ وہ کیا کام کر رہا ہے۔ جواب ملے گا "امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس"۔ وہ "بزنس" جس میں نہ ہاتھ ہلانا پڑے نہ پاؤں اور دولت چھما چھم چلی آئے۔ ساری تگ و تاز ایک لائسنس حاصل کرنے تک کی ہے۔ اس کے بعد دولت ہی دولت ہے۔ آپ سوچئے کہ اس طریق حصولِ دولت کو چھوڑ کر،

(بقایا حاشیہ صفحۂ سابق) اب آپ اگر پاکستانی شاخ سے اس کے متعلق پوچھیں گے تو وہ صاف کہدیگی کہ ہندوستانی شاخ سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح لاہوری میرزائی کہدیا کرتے ہیں کہ قادیانی میرزائیوں سے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ حالانکہ۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ یہ ہے "اسلامی جماعت"

خدا وندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

کارخانے بنانے کی کون فکر کرے گا جن میں خود مالک کو بھی مزدوروں کی طرح سر کھپانا پڑتا ہے۔ اس لئے ہماری تمام انڈسٹریز ویسے کی ویسی دھری رکھی ہیں۔ "خدا کی دی ہوئی" دولت بے شمار ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوئی ولایت اور امریکہ آرڈر بھیج دیا۔ بنی بنائی چیز گھر آ پہنچی۔ بنانے کی زحمت کون گوارا کرے اور کیوں کرے؟

ان حالات کے پیشِ نظر، کامیابی کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ حکومت انڈسٹریز کو (Nationalise) کرلے۔ خود کارخانے کھولے اور اس باب میں کسی کی بات نہ سنے۔ قوم کا روپیہ ملک کے اندر رہے گا اور کروڑوں بے کار آبادی کام پر لگ جائے گی۔ اور اس طرح ہندوستانی مسلمان کے مسئلہ کا ایک حل بھی نکل آئے گا۔

لیکن ہماری دشواری یہ ہے کہ ہمیں پاکستان محض تقریرات اور بیانات کے زور سے مل گیا۔ اس لئے ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر مشکل کا حل تقریریں اور بیانات ہی ہیں جب تک ہم اپنے آپ کو اس حسین فریب سے نہیں نکالتے، کشاد کی راہ ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ　　　بہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

فطرت لہو ترنگ ہے ناداں نہ "جل ترنگ"　　　خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات

تقریروں کے "جل ترنگ" سے میدان فتح نہیں ہوسکتے۔ یہاں تو کچھ کرنے ہی سے کچھ ہوسکے گا۔

قسمت بادہ باندازۂ جام است ایں جا

سامانِ پرورش

کسی مملکت کا پہلا فریضہ، افرادِ مملکت کے سامانِ پرورش کی دیکھ بھال ہے ("پرورش" میں جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں آجاتی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے "جسم اور علم" دونوں کی توانائی اور وسعت کو معیارِ سیادت قرار دیا ہے۔ سرِدست ہمارے زیرِنظر جسمانی پرورش کے سامان کا مسئلہ ہے۔ ذہنی تربیت کا سوال ذرا آگے چل کر آئے گا)۔ ایک اسلامی مملکت میں، جس کا دستور قرآن کے اصولوں پر متشکل ہو، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کی تمام تر ذمہ داری خود مملکت کے سر ہوتی ہے لیکن غیر قرآنی مملکتوں میں بھی، ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہ سہی، ان کی دیکھ بھال تو مملکت کے ذمے یقیناً ہونی چاہیئے۔ ذرا مغربی اقوام کو دیکھیئے۔ وہ افرادِ مملکت کے سامانِ خورد و نوش اور اسباب بود و ماند کے متعلق کس قدر حزم و احتیاط اور نگہ پرداخت سے کام لیتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہیں کہ قوم کی زندگی کا دار و مدار، افرادِ قوم کی صحت اور توانائی پر ہے اور صحت اور توانائی ماحصل ہوتی ہیں سامانِ خورد و نوش اور اسباب بود و ماند کا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سب کچھ "اللہ توکل" ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا کسی کا کام (Concern) ہی نہیں کہ لوگوں کو کیا کھانے کو ملتا ہے اور کس طرح ملتا ہے؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیسے رہتے ہیں؟ ان کی صحت کیسی ہے اور کیوں ایسی ہے؟ بچوں کی نشو و نما ہو رہی ہے یا نہیں؟ وہ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے قابل بن رہے ہیں یا نہیں؟ کسی کو ان سوالات سے کچھ علاقہ ہی نہیں۔ آبادی کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے جنھیں ضروریاتِ زندگی یا تو ملتی ہی نہیں یا ملتی ہیں تو بہت کم مقدار میں۔ اور جو کچھ ملتا ہے وہ قطعاً وہ نہیں ہوتا جو اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ دودھ۔ گھی۔ مکھن۔ گوشت۔ پھل۔ ترکاریاں۔ اناج، یہی کچھ ہے جس سے انسانوں کے جسم بنتے ہیں۔ آپ

پہلے یہ سوچیے کہ ملک میں کتنے افراد ایسے ہیں جنہیں یہ چیزیں ضرورت کے مطابق ملتی ہیں؟ پھر یہ سوچیے کہ جنہیں یہ چیزیں ملتی ہیں ان میں سے کتنے ہیں جنہیں فی الواقعہ وہی چیز ملتی ہے جو وہ خریدتے ہیں! آج کون کہہ سکتا ہے کہ جس "مرکب مرہم" کو گھی کہہ کر فروخت کیا جاتا ہے اس میں کتنا حصہ گھی کا ہوتا ہے! کسے معلوم ہے کہ جس سیال ابیض کو دودھ کہہ کر بکارا جاتا ہے اس میں کتنی مقدار دودھ کی ہوتی ہے! کون بتا سکتا ہے کہ جس چیز کو ہم آٹا کہہ کر اس سے تنور شکم جھونک لیتے ہیں اس میں کتنا جز گیہوں کا ہوتا ہے؟ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا بجز ان سوکھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچوں کے جنہیں کبھی انسانی جسم کہا جاتا تھا، اس زرد زرد بے نور رنگت کے جسے خون کی سرخی کہہ کر پکارا کرتے تھے، ان پتلے پتلے، مردنی چھائے ہوئے حشرات الارض کے جن کا نام انسانی بچے ہوا کرتا تھا۔

پھر جس قیمت پر یہ چیزیں ملتی ہیں ان کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ آپ کوئی چیز خریدیئے، یہ دکاندار کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ اس کی قیمت کیا مانگ لے؟ جو اس کے جی میں آئے مانگ لے؟ آپ اس چیز کا حساب پھیلا کر دیکھئے۔ مشکل ایک روپیہ لاگت بیٹھے گی اور وہ پانچ روپے مانگ رہا ہوگا۔ اور آپ کو یہ دام دینے پڑیں گے؟ ملک میں اس کا کوئی انتظام نہیں کہ بازاروں میں فروخت کیا ہو رہا ہے اور اس کی قیمتیں کیا چارج کی جاتی ہیں؟ باقی رہا "خدا" کا خیال۔ سو اس کے "ایجنٹوں" نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور تجارت کو حلال۔ اس لئے آپ سود نہ لیجئے (اور لیجئے تو اس کا نام سود نہ رکھئے۔ اسے منافع کہئے) اور تجارت میں جس قدر منافع آپ چاہیں حاصل کیجئے۔ یہ سب حلال و طیب ہے اور شیر مادر کی طرح جائز۔ لوٹئے اور جی بھر کر لوٹئے۔ لیکن اس لوٹ میں "اللہ میاں" کو ضرور شامل کر لیجئے۔ اس کا حصہ نکال کر ہمیں دیدیجئے۔ ہم اس تک پہنچا دیں گے۔

چلئے! دنیا اور عاقبت دونوں میں خلاصی ہو گئی۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح قوم کتنے دن جی سکے گی؟ قوم کے بڑے بوڑھے تو خیر، پرانی ہڈیاں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح رینگتے، سسکتے، دن پورے کر جائیں گے۔ سوال ان بچوں کا ہے جنہیں کل کو "ملت اسلامیہ پاکستانیہ" بننا ہے۔ کیا ہمیں اس امر کی کچھ بھی فکر ہے کہ یہ کے دن جئیں گے اور جتنے دن جئیں گے کس حالت میں جئیں گے! سوچئے کہ یہ باتیں بڑی گہری سوچ کی طالب ہیں! بچوں کی پرورش کا مسئلہ کسقدر اہم ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے لگا لیجئے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلامی مملکت میں ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کیلئے تمام افراد کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے جس دن سے بچہ دودھ پینا چھوڑتا اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ ایک رات حضرت عمرؓ حسب معمول گشت لگا رہے تھے کہ ایک خیمے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے جا کر بچے کی ماں سے کہا کہ اسے چپ کراؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے پھر جا کر کہا۔ جب دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا تو آپ نے بچے کی ماں سے ڈانٹ کر پوچھا کہ بات کیا ہے؟ بچہ سوتا کیوں نہیں! اس عورت کو کیا معلوم تھا کہ پوچھنے والا کون ہے۔ وہ خود بچے کے رونے سے تنگ آ چکی تھی۔ اس نے (ہمارے ہاں کی بولی میں) جواب دیا کہ بچہ رو رہا ہے عمر کی جان کو! آپ نے کہا کہ بچے کے رونے میں عمر بیچارا کیسے آ گیا؟ اس عورت نے کہا کہ عمرؓ نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ بچے کا وظیفہ اس دن سے شروع ہو جس دن وہ دودھ چھوڑ دے۔ میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں اور یہ روتا ہے، سوتا نہیں! پوچھنے والا بغیر ایک لفظ کہے واپس آ گیا۔

مدینے کی مسجد میں صبح کی نماز ہو رہی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ امام ہیں۔ مقتدی دیکھتے ہیں کہ نماز پڑھاتے پڑھاتے حضرت عمرؓ ہچکیاں لیکر رونے لگ گئے ہیں۔ ان کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ نماز کے بعد سب پریشان ہو کر آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ روتے جاتے ہیں اور فقط اتنا کہتے ہیں کہ یا اللہ! عمر کو معاف کر دینا۔ معلوم اس کے ہاتھوں کتنے بچوں کا خون ہو چکا ہے! اس کے بعد فوراً منادی کراتے ہیں کہ ہر بچے کا وظیفہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جائے گا۔

یہ تھی ان لوگوں کی نگاہ میں بچوں کی قدر و قیمت اور ان کی پرورش کے بارے میں احتیاط جو جانتے تھے کہ آج کے بچے کل کی قوم بننے والے ہیں!

تعلیم جسمانی پرورش کے ساتھ ہی ذہنی تربیت کا سوال وابستہ ہے۔ اسے تعلیم کہتے ہیں۔ تعلیم کی اہمیت کے متعلق اس سے زیادہ اور کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ جس قسم کی تعلیم آپ اپنے بچوں کو آج دینگے اس قسم کی قوم کل کو تیار ہو جائیگی۔ اگر آپ انھیں تعلیم دینگے ہی نہیں تو قوم جانوروں اور وحشیوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مدینہ میں تشکیل مملکت کے بعد پہلی جنگ (بدر) کے قیدیوں کے فدیہ کا سوال پیدا ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ ان میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں وہ دس دس بچوں کو تعلیم دیں۔ یہی ان کا زر فدیہ متصور ہوگا۔ ولایت میں یہ حالت ہے کہ تعلیم لازمی ہے لیکن جو بچے اپاہج ہیں اور کسی صورت میں بھی اسکولوں تک نہیں پہنچ سکتے، اساتذہ ان کے گھروں پر جا کر تعلیم دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں چھوٹے چھوٹے مقامات کو تو چھوڑیئے، حکومت کے دار السلطنت کراچی میں یہ حالت ہے کہ تعلیم کیسی ہونی چاہئے تو بعد کا سوال ہے، ہزارہا بچے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اسکولوں میں داخل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا حکومت سے یہ کہنا کہ بچوں کیلئے قرآنی خطوط کے مطابق تعلیم کا انتظام کرو، خواہ مخواہ اپنا مذاق اڑانا ہے۔ دین کا ذکر کیا واں سرے ہی غائب ہے گریباں سے۔ یوں تو بیانات اور تدبیری اعلانات (Planning schemes) کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی بھی دوسرے سے پیچھے نہیں لیکن شعبۂ تعلیم نے اس مسئلہ میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ بہر حال ہم اس باب میں متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہم قوم کے سوچنے والے طبقے سے بار بار کہہ چکے ہیں کہ وہ کچھ دیر کے لئے یہی تصور کر لیں کہ وہ ہنوز اسی دور میں ہیں جس میں تقسیم ہند سے پہلے تھے۔ اگر ہم اس زمانے میں اپنی مفلسی اور نادار کی کے باوجود، مسلم یونیورسٹی اور انجمن حمایت الاسلام لاہور جیسے ادارے بنا سکتے تھے تو آج اس خوشحالی کے دور میں، اس قسم کا تعلیمی ادارہ کیوں نہیں بنا سکتے جس میں ہمارے بچوں کے قلب و دماغ صحیح اسلامی سانچوں میں ڈھل سکیں! لیکن شاید اس کی وجہ ہماری خوشحالی ہی ہے کہ ہم آج کچھ نہیں کر سکتے۔ قوم کا خوشحال طبقہ، دولت سمیٹنے کی فکر میں بری طرح بدحواس ہو رہا ہے۔ اس سے کسی صحیح تعمیری کام کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ البتہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے مذہبی کاموں کیلئے "زکوٰۃ" نکال دیتے ہیں تاکہ ان کا باقی مال "پاک اور مطہر" ہو جائے۔ یہی وہ "زکوٰۃ" ہے جس سے مولوی صاحبان بڑے بڑے دار العلوم تعمیر کر کے اپنے طبقے کی معاش کا انتظام کرنے کی فکر میں ہیں۔ حکومت بھی ان دار العلوموں کی اسکیم سے مطمئن ہے اسلئے کہ قوم میں جسقدر فقدانِ عقل اور افلاسِ ہوش ہو، اسی قدر حکومت آسان ہو جاتی ہے۔

بہرحال، اس باب میں ہم قوم کے صاحب فکر و احساس طبقہ سے ایک بار پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ حکومت کے (Plans) کی طرف نہ دیکھیں اور جس طرح سرسید مرحوم نے کیا تھا، قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم کا انتظام خود کریں۔ ورنہ جہاں گھی کی جگہ "بناسپتی مرہم" ان کے جسموں کو تباہ کریگا، تعلیم کی جگہ جہالت ان کی روح کو کچل دیگی اور پھر وہ نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے۔ اور اس طرح قرآن کے الفاظ میں قوم کی جڑ کٹ جائے گی۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا۔

یہ تو ہے مستقبل کے متعلق۔ لیکن موجودہ نوجوانوں کا مسئلہ ان سے بھی زیادہ غور طلب اور پریشان کن ہے۔ مُلّا کے غلط مذہب نے جو بے بنیاد اقدار اسوقت تک مقرر کر رکھی تھیں، زمانے کے تھپیڑوں نے ان اقدار کی راکھ تک اڑا دی۔ لیکن ان اقدار کی جگہ صحیح اقدار قوم کے نوجوانوں کو دی نہیں جا رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں خلاء واقعہ ہو رہا ہے اور چونکہ کارگہ فطرت میں خلاء محال ہے اسلئے اس (To Let) مکان کے اندر ناخواندہ کرائے دار گھسے چلے آ رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس "ذہن میں خدا نہیں ہوتا اس میں شیطان بسیرا کر لیتا ہے"۔ اسلئے ہمارے نوجوانوں کے قلوب و اذہان بڑے طور پر غیر اسلامی تصورات سے متاثر ہو رہے ہیں اور وہ خدا فراموشی کی اس بڑھتی ہوئی رو میں کشاں کشاں بہے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج نہ تو وہ خوفِ جہنم ہے جس سے انھیں مُلّا ڈراتا ہے۔ اسلئے کہ یہ نوجوان جنت اور جہنم کے "مذہبی" تصور سے پہلے ہی باغی ہو چکے ہیں۔ نہ ہی انھیں "اسلام خطرے میں ہے" کا بگل اس رو میں بہنے سے روک سکتا ہے، اسلئے کہ ملاّ نے اسلام کی جو تصویر ان کے سامنے پیش کر رکھی ہے اس اسلام کو یہ نوجوان، سرمایہ دارانہ ذہنیت کا پیدا کردہ تخیل سمجھتے ہیں اور اسے مٹانے میں غریبوں کا اور مزدوروں کا بھلا خیال کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو اس سیلاب سے بچانے کی بڑی ضرورت ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کے سامنے "قرآنی اسلام" کو پیش کیا جائے۔ اس باب میں ہمارا اپنا تجربہ ہمارے لئے بڑی تقویت اور یقین کا موجب ہے۔ ہم نے ایسے ایسے شوریدہ سر نوجوانوں کو دیکھا ہے جو ذہنی طور پر مروجہ اسلام سے یکسر کٹ کر علیحدہ ہو چکے تھے اور اپنے جدید تصورات میں بڑے پختہ یقین اور بے باک واقعہ ہوئے تھے۔ ایسے بے باک کہ انھیں خدا، رسول، وحی، آخرت کے نام تک سے چڑھ تھی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا گیا تو ان کا تمام انکار و جحود، اقرار و ایمان میں بدل گیا اور ان کی سرکشی اور عناں تابی تسلیم و انقیاد میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا انکار و سرکشی کی اس بڑھتی ہوئی طغیانیوں اور سیلاب انگیزیوں کی روک تھام کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ قرآن کو ہمارے نصاب تعلیم میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن قرآن سے مراد وہ قرآن نہیں جسے مسجدوں اور مکتبوں میں دہرا دہرا کر "ثواب" حاصل کیا جاتا ہے بلکہ وہ قرآن جو ہماری زندگی کے معاملات کو سنوارتا اور جن مشکلات سے آج دنیا دوچار ہے ان کا تسلی بخش حل بتاتا ہے۔ اس قسم کا نصاب بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ کسی کی نیت اور ارادہ ہو۔

لیکن اس سے ہم پھر اُسی نقطہ پر آ پہنچے جہاں سے چلے تھے یعنی یہ کہ آج ضرورت ہے ایک ایسے "سرسید" کی جو قوم کا نمائندہ بنکر قوم کے بچوں کیلئے صحیح تعلیم کا انتظام کرے اور اس کیلئے نہ حکومت کی امداد کا انتظار کرے نہ کسی آنے والے "مہدی" کا۔ اگر کچھ عرصہ تک ایسا نہ ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے عوام بالکل اسی انداز کے ہو جائیں گے جس انداز کے عوام دیگر ممالکِ اسلامیہ میں موجود ہیں۔ اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ایسی سرپھروں کی جماعت بن جائیگا جسے قابو میں رکھنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ البتہ چند مخصوص خاندانوں کے نوجوانوں کی تعلیم اس انداز کی ہوا کریگی جو حکومت کی مسندیں سنبھال سکیں۔ انشاء اللہ خیر سلاّ۔

ریڈیو

دورِ حاضرہ میں ذہنی تربیت و تعمیر کا بہترین ذریعہ ریڈیو ہے۔ زندہ اقوام اس کے ذریعے، قلب کے میلانات، ذہنی رجحانات اور نگاہوں کے زاویے بدل رہی ہیں۔ یہ ہے ریڈیو کا بنیادی مفہوم ان اقوام کے ہاں۔ لیکن چونکہ انسانی طبائع، ذہنی تربیت کے خشک ذرائع سے جلد اُکتا جاتی ہیں اسلئے انھوں نے اس پوسٹ میں شگفتگی اور اس صلابت میں لوچ پیدا کرنے کے لئے، ساتھ ساتھ تفریح و تفنن کے پروگرام بھی شامل کر رکھے ہیں۔ لیکن وہ اس تفریحی پروگرام میں بھی اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے جس کے حصول کا ذریعہ ریڈیو کا شعبہ ہے۔ ہمارے ہاں ریڈیو کا بنیادی مقصد ہی تفریح سمجھ لیا گیا ہے اور اس پروگرام میں دوسری چیزیں محض تنوع پیدا کرنے کیلئے شامل کر لی جاتی ہیں۔ اگر یہ تفریحی پروگرام بھی ایسا ہو جس سے فی الواقعہ کچھ تفریح کا سامان بہم پہنچ جائے تو بھی انسان اسے گوارا کر لے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

لیکن ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ جہاں تک صرف تفریح کا تعلق ہے اس کیلئے بھی ہمارے ریڈیو اسٹیشن ایسا پروگرام پیش کرتے ہیں جس سے سعدی کا وہ قصہ یاد آجاتا ہے جس میں اس نے قوالوں کو اپنی بگڑی دیکر راگ سننے سے توبہ کی تھی۔ ہمیں اس پر ناز ہے کہ ہم نے مرکزی ریڈیو اسٹیشن کی ایک ایسی عمارت بنائی ہے جس کے مشمولات کا مقابلہ یورپ کے اسٹیشن نہیں کر سکتے۔ لیکن خالی عمارت سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو محض ایک نیام ہے۔ زرنگار و بے شمشیر۔ اصل چیز تو وہ پروگرام ہیں جو آپ اس عمارت سے نشر کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے ارباب حل و عقد کو اس حقیقت کا علم ہے یا نہیں کہ پاکستان کا صاحب ذوق طبقہ، تفریح طبع (موسیقی) کے پروگرام کے لئے مجبوراً ہندوستان کا ریڈیو سنتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ ہی وہاں سے اور بھی کیا کچھ نہیں سننا پڑتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ واقعہ ہمارے ہاں کے تفریحی پروگرام پر ایسی کھلی ہوئی تنقید ہے جس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

لیکن ابھی اس موضوع کا ایک حصہ اور ہے جس کے تصور سے نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اور وہ ہے ہمارے ریڈیو کے درسِ قرآن کا پروگرام۔ ایک آزاد اسلامی مملکت کا ریڈیو اسٹیشن ہو اور اس سے قرآن جیسی پائندہ اور درخشندہ کتابِ زندگی کا درس نشر کیا جائے! اگر ان نشریات سے دنیائے قلب و ذہن میں انقلاب نہ واقع ہو جائے تو قرآن کیا ہوا؟

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل — کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

لیکن جو کچھ ہمارے ہاں سے ہر صبح نشر ہوتا ہے، خدا کرے کہ اسے کوئی ذی ہوش غیر مسلم سننے نہ پائے! اس درس کو نشر کرنے والوں سے تو کچھ کہنا ہی بے سود ہے۔ ہم صرف نشر کرانے والوں سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا انھیں اس کا بھی علم ہے کہ ان کی اس "مبارک و مسعود دینی خدمت" سے اس وقت تک کتنے نوجوان اسلام سے متنفر ہو چکے ہیں اور کتنوں کے دل میں اس کے خلاف بغاوت کے جذبات کی پرورش ہو رہی ہے!

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!

لیکن انھیں اس کی خبر کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ ان کا معیارِ خوب و ناخوب عوام کے خطوط کے وہ طومار ہیں جو اس "درس شریف" کی حمد و ستائش میں ہر روز ریڈیو اسٹیشن میں موصول ہو جاتے ہیں۔ ہم ان سے اس باب میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ زندہ اقوام کے ریڈیو کا مقصد قلب و نگاہ کی تربیت و اصلاح ہوتا ہے، عوام کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتا۔ عوام بالعموم بہت نیچی سطح پر ہوتے ہیں۔

اوران کے لئے ان کی سطح کے مطابق سامان فراہم کرتے رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی قوم کی سطح کو ذرا بھی بلند نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن اگر اس کے باوجود، ارباب حل وعقد اپنے مصالح کی بنا پر اس پر مصر ہیں کہ وہ عوام کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں تو ہم باادب اتنی گذارش کرینگے کہ اس کے لئے کم از کم قرآن کو ہدفِ ناوکِ جہالت نہ بنائیں! ہمارے متعلق اقوامِ عالم نے جو رائے قائم کر رکھی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ لیکن قرآن کے متعلق ابھی ان کے دل میں حسنِ ظن موجود ہے۔ خدا کے لئے ان کے دل میں وہ حسنِ ظن رہنے دیجئے۔ آپ کا مطلب تو "ثواب" حاصل کرنے ہی سے ہے۔ اس کیلئے سینکڑوں اور طریق بھی ہیں۔ انھیں اختیار کر لیجئے لیکن قرآن کی حالت پر رحم فرمائیے کہ یہ کتاب (بقول علامہ اقبالؒ) پہلے ہی بڑی "مظلوم" ہے۔

رابطۂ عوام

اپنی اور غیروں کی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی حکومت میں، عوام حکومت کو اپنے سے الگ نہیں سمجھتے۔ اور غیروں کی حکومت میں، حکومت اور عوام دو الگ الگ دوائر کا نام ہوتا ہے جن کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام چار برس سے مسلسل اس حقیقت کو دہرا رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی اقدام ایسا نہیں کیا گیا جس سے عوام، حکومت کو اپنے سے الگ نہ سمجھیں۔ یہاں ارباب حکومت کی دنیا الگ ہے اور افرادِ مملکت کی دنیا الگ۔ جلسوں اور جلوسوں کی ہماہمی سے اپنے آپ کو دھوکا دے لینا الگ بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ حکومت اور عوام دو الگ الگ جزیرے ہیں جن کا درمیانی فاصلہ کم نہیں ہو رہا۔ (بلکہ دن بدن زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے)۔

تفرقہ

اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک یہ حقیقت ہے کہ آزادی ملنے کے بعد، بجائے اس کے کہ ملت میں وحدت پیدا ہو جاتی، اس کے اور بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا اولیں سبب پاکستان میں مسلم لیگ کا قیام تھا۔ طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر شرح وبسط سے لکھا جا چکا ہے جس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ حقیقت بڑی دلخراش اور جگر سوز ہے کہ آج ملت بری طرح سے پارٹیوں میں بٹ چکی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوتا ہے۔ ان پارٹیوں میں ہمارے نزدیک سب سے زیادہ نقصان رساں، اسلامی جماعت ہے جس نے جماعت کے ممبروں کے دل میں غیر ممبروں کے خلاف (جنھیں وہ "نسلی مسلمان" سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو "اصلی مسلمان" اور اپنی جماعت کے سربرآوردگان کو صالحین کی جماعت) ایسے ہی جذباتِ نفرت پیدا کر رکھے ہیں جیسے میرزائیوں کے دل میں غیر میرزائیوں کی طرف سے ہوا کرتے تھے (اور اب بھی ہیں، اگرچہ اب بنا بر مصلحت، ان جذبات کا اظہار پہلی سی شدت کے ساتھ نہیں ہوتا)۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیاست جب بھی مذہب کا نقاب اوڑھ کر سامنے آتی ہے اس کے نتائج وعواقب بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس جماعت نے گذشتہ الیکشن میں اپنی ناکامی کے بعد جو پروگرام مرتب کیا ہے اس کی رو سے عجب نہیں کہ وہ ایک دن اپنی متوازی حکومت (Parallel Govt.) قائم کر لے اور اس طرح ملک میں خلفشار پیدا کر کے امنِ عامہ کو جہنم میں جھونک دے۔ ہم اس حقیقت کو بار بار دہرا چکے ہیں کہ یہ تحریک ایک جدید آمریت ہے جس کی بنیاد معاشی ضروریات پر ہے۔ اگر اس میں کچھ شبہ ہو تو آپ اس تحریک کے ارباب حل وعقد کی آج کی مالی حالت دیکھئے اور پھر تحریک سے پہلے کی حالت۔ دونوں کا موازنہ حقیقت کو بے نقاب کر دیگا۔

صوبائی تفریق

وحدتِ ملت کے ضمن میں ایک نقطہ ایسا ہے جس کی طرف اربابِ حکومت کی توجہ خاص طور پر دلانا ضروری ہے ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری۔ اس حقیقت کو ہم میں سے ہر شخص دن میں دس بار دہراتا ہے کہ اسلام، نسب، نسل، قوم، وطن، رنگ، زبان کے تمام انسان ساز امتیازات کو مٹا کر معیارِ تکریم فقط جوہرِ ذاتی (تقویٰ) کو قرار دیتا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور قرآن کی نصِ صریح۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں دو رائے ہو نہیں سکتیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے اس حقیقت کو اس طرح تسلیم کرنے والی اور بار بار دہرانے والی حکومت پاکستان نے عملاً کیا کیا ہے۔ انھوں نے مرکزی ملازمتوں میں صوبہ دار نیابت کا اصول نافذ کر رکھا ہے۔ ذرا سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ مثلاً پاکستان کی اعلیٰ ترین سروس کا امتحان ہوتا ہے جس میں ایک سو امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ ان امیدواروں کی ان کے حاصل کردہ نمبروں کے لحاظ سے فہرست مرتب کر لی جاتی ہے، اب عدل و مساوات اور جوہرِ ذاتی کے معیار کا تقاضا یہ ہے کہ اسامیوں کے مطابق، نمبروار امیدوار منتخب کر لئے جائیں۔ لیکن کیا یہ نہیں جاتا۔ کیا یہ جاتا ہے کہ ان اسامیوں کو صوبہ داری نیابت کے لحاظ سے تقسیم کر لیا جاتا ہے اور اس کے مطابق امیدواروں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ مثلاً ایک سندھی لڑکا دسویں نمبر پر ہے اور ایک بنگالی پچاسویں نمبر پر، تو اس سندھی کو چھوڑ دیا جائے گا اور بنگالی کو منتخب کر لیا جائیگا۔ غور فرمائیے کہ اس بنیادی بے اصولی کے نتائج کس درجہ دور رس اور تباہ کن ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مملکتِ پاکستان، بہترین دماغوں سے محروم کر دی جاتی ہے اور ان کی جگہ کمتر قابلیت کے افراد، حکومت کی مشینری کے کل پرزے بنا لئے جاتے ہیں۔ سوچئے کہ جب دس بیس سال تک معیارِ انتخاب ایسا ہی رہا تو حکومت کی مشینری کس قسم کے عناصر پر مشتمل ہو جائیگی! اس کے بعد دوسری طرف دیکھئے۔ جس اعلیٰ پوزیشن کے امیدوار کو نظر انداز کر کے، پست درجے کے امیدوار کو منتخب کر لیا گیا ہے، اس امیدوار کے دل میں حکومت کا کیا وقار باقی رہ جائیگا۔ اس کا سینہ عمر بھر کے لئے آتشدانِ شکایت بنا رہے گا۔ اور آگے بڑھئے۔ فرض کیجئے کہ وہی بنگالی امیدوار دو چار سال کے بعد، سندھ کے اسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر بنکر آجاتا ہے، جو اس امیدوار کا وطن ہے۔ جس پر اسے ترجیح دی گئی تھی حالانکہ اس کا نمبر دسواں تھا اور اس کا پچاسواں۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس سندھی امیدوار کا خاندان کبھی اس بنگالی ڈپٹی کمشنر سے تعاون کرے گا جو ان کے قابل اور ہونہار فرزند کا جائز حصہ چھین کر، ڈپٹی کمشنر بنا ہے اور ان کا لڑکا کہیں کلرکی کر رہا ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ اس صوبہ داری نیابت سے صوبائی عصبیت کی لعنت کس درجہ عمیق اور شدید ہوتی جا رہی ہے؟ اور چند سال کے بعد اس کی کیفیت کیا ہو جائیگی؟

کہدیا جائے گا کہ حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ بعض صوبے اس نیابت پر مصر ہیں کیونکہ وہ مقابلہ کی بنا پر ملازمتوں میں آ نہیں سکتے اس لئے وہ نیابت کی راہ سے قصرِ حکومت میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اس باب میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ جو صوبے، ان تمام نقصانات کے باوجود جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اس طریقِ انتخاب پر اصرار کرتے ہیں وہ قطعاً پاکستان کے بہی خواہ نہیں۔ قوم حق رکھتی ہے کہ پوچھے کہ وہ کونسے صوبے ہیں اور ان کے کونسے نمائندے اس طرح کی تخریبی کوششوں پر مصر ہیں۔ یہ مسئلہ تمام ملت کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لئے کہ اس سے پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس لئے قوم کو کم از کم معلوم تو ہو کہ

پاکستان کی بنیادوں کو اس طرح کمزور کرنے اور ملت کو عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے کون سے "بزرگانِ ملت" ہیں!

یاد رکھئے! پورے کا پورا پاکستان ایک مملکت ہے۔ پاکستان کے تمام مسلمان ایک ملت ہیں۔ ان میں انتخاب کا معیار صرف جوہرِ ذاتی ہونا چاہئے۔

جو کریگا امتیاز رنگ و بو مٹ جائے گا ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا نسب

اسی بنا پر ہم نے تحریک کی تھی کہ پاکستان کے صوبوں کو مٹا کر ساری مملکت کو ایک مرکز کے تابع لے آنا چاہئے اور انتظامی سہولت کی خاطر ملک کو ادلتے بدلتے رہنے والے دائروں میں بانٹنا چاہئے جن میں نسل، زبان، رنگ کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ کیا جاتا، صوبہ دار نیابت کے اصول سے صوبہ دارانہ گرہوں کو اور زیادہ کس دیا گیا تاکہ کوئی یہ نہ کہنے پائے کہ تمام مسلمان ایک ملت ہوتے ہیں۔

مغالطہ ایک اور بات ہے جس نے ہمیں مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد سے دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارا خلا ملا زیادہ ہو گیا ہے۔ (یہ امر موجب اطمینان ہے اس لئے کہ شاید اس سے وحدتِ ملتِ اسلامیہ کا وہ خوابِ شیریں پھر سے حقیقت بن جائے جو ہمارے لئے وجہِ سکونِ جاں ہے)۔ ہم جب اپنا مقابلہ ان ممالک سے کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ان سے بہت آگے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہم اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ قوم ہیں اور ہم نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اول تو ان ممالک سے تقابل کے بعد اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھنا ہی غلطی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہماری یہ ترقی بھی ہماری کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ پاکستان کے ساتھ ورثہ میں آئی ہے۔ انگریز نے اپنے سو سالہ عہدِ حکومت میں (اپنے مقاصد کے لئے یا باشندگانِ ملک کی بہبود کی خاطر) ہندوستان میں بہت سی وہ چیزیں رائج کر دیں جو مغربی ممالک کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ ریل۔ تار۔ ڈاک۔ ٹیلیفون۔ پختہ سڑکیں۔ عمدہ بندرگاہیں۔ ہوائی اڈے وغیرہ۔ ان کی وجہ سے ہمارا ملک، ان امور میں دیگر اسلامی ممالک سے آگے ہے۔ آئینی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی وجہ سے ہماری حکومتی مشینری میں وہ ابتری نہیں جو دیگر اسلامی ممالک میں پائی جاتی ہے۔ تعلیم کے لئے ہم مرہونِ کرم ہیں سرسید مرحوم کی ان تھک کوششوں کے، جن کی وجہ سے ہم آج دنیا کی باتیں سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے بھی دیگر اسلامی ممالک سے آگے ہیں۔ فکری اعتبار سے خدا کروٹ کروٹ جنت عطا کرے علامہ اقبال رح کو جس نے ہمیں ایسی سرفرازی عطا کر دی ہے کہ ہمیں، اور نہیں تو کم از کم مسلم اقوام کی فکری امامت کا شرف حاصل ہے۔ اور اگر حکومت کی طرف سے ذرا بھی حوصلہ افزائی ہو تو ہم میں ایسے ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی مغربی مفکرین سے کم نہیں۔

باقی رہی ہماری آزادی سو وہ صدقہ ہے قائداعظم (مرحوم و مغفور) کی سیاسی بصیرت اور کیرکٹر کا۔ ان تمام امور میں ہماری کوششوں کا کوئی دخل نہیں۔

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

لہٰذا اگر ہم آج اسلامی ممالک میں سب سے پیش پیش ہیں تو اس میں ہماری سعی وعمل کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے یا تو ورثہ میں پایا ہے یا حالات کا نتیجہ ہے۔ معاشی اعتبار سے ہماری خوشحالی سن، روئی اور گیہوں کی وجہ سے ہے جو ہماری ریڑھ کی ہڈی کی کڑیاں ہیں۔ یہ بھی دائیہ فطرت کی کرم گستری ہے۔ ہمارا کمال نہیں۔ وہ تو یوں کہئے کہ ہمارے کاشتکاروں کو اور کوئی کام نہیں آتا جس کی وجہ سے وہ اس طرح سال بھر لہو پانی ایک کرکے اپنی محنتوں کا ماحصل ہمارے لئے وجہ تقویت و افتخار بنا دیتے ہیں۔ ورنہ ہمارے نظام زمینداری نے جو حالت ان کی بنا چھوڑی ہے اس میں ان کا زندہ رہنا بھی معجزہ ہے۔

پاکستان کا تحفظ

ہم نے یہاں تک جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق یوں سمجھئے جیسے کسی خاندان کے افراد، اپنے بچے کی صحت، توانائی، تعلیم، مستقبل وغیرہ کے متعلق، گھر میں بیٹھکر، صلاح اور مشورے کرتے ہیں۔ پاکستان، ہم سب افراد خاندان (مملکت) کا مشترکہ مفاد ہے جس کا تحفظ ہم سب کا یکساں فریضہ۔ اسلئے اس میں نہ کسی کے سر پر کسی کا احسان ہے نہ کسی کو برا ماننے کی ضرورت۔ ایک بات البتہ ایسی ہے جسے ہم شروع سے برابر دہراتے چلے آرہے ہیں اور وہ یہ کہ جہاں تک سرزمین پاکستان کے تحفظ کا سوال ہے اس میں کسی قسم کی کوتاہی، نقص، تساہل، یا تغافل کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ نہ اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ خواہ یہ افراد مملکت کی طرف سے ہو خواہ ارباب حکومت کی جانب سے۔ اس باب میں ہم اہل پاکستان کی دشواری یہ ہے کہ ایک تو ہماری مملکت نوزائیدہ ہے دوسرے شومئی قسمت سے ہمیں ہمسایہ ایسا ملا ہے جس کی تنگ نظری، حسد، کینگی، کینہ پروری، بددیانتی، بدعہدی، کٹ حجتی، نامعقولیت اور بے اصولا پن ضرب المثل ہے۔ ایسے ہمسائے سے واسطہ پڑنا، ہزار مصیبتوں کی ایک مصیبت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا علاج، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی متعدد بار لکھ چکے ہیں، صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ انھیں ایسی شکست دی جائے کہ ان کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ خود بھی آرام اور چین سے بیٹھ جائیں گے اور دنیا بھی امن میں رہے گی۔ اس باب میں ہندوستان خود اس حد تک آگے بڑھتا چلا آرہا ہے کہ شاید پاکستان کیلئے جنگ کے سوا اور چارۂ کار ہی نہ رہے۔ اگر ایسا وقت آگیا تو قوم کے دو حصے ہوں گے۔ ایک محارب حصہ جو براہ راست جنگ میں شریک ہوگا اور دوسرا شہری طبقہ (Civil population) جو ان کے پیچھے ہوگا۔ جہاں تک محارب حصے کا تعلق ہے اس کی بابت صرف حکومت ہی جان سکتی ہے کہ اس کی امکانی وسعتیں کہاں تک ہیں۔ اس باب میں ہمیں حکومت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اور حکومت کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی فوراً دینی ہوگی۔ اس وقت ہر فرد مملکت کا مال اور جان ارباب حکومت کے سپرد ہوگا۔ لیکن جہاں تک شہری طبقہ کا تعلق ہے، ان کے فرائض، محارب حصے سے کچھ کم نہیں ہوں گے۔ آجکل کی جنگ کی ٹیکنیک ہی یہ ہے کہ شکست و فتح کا مدار، شہری آبادی کی قوت حوصلہ اور طاقت برداشت پر ہوتا ہے۔ جنگ، پھولوں کی سیج نہیں ہوتی اس میں بڑی بڑی مصیبتیں آیا کرتی ہیں۔ اگر شہری آبادی نے ان مصیبتوں کا مقابلہ کرلیا اور اس طرح اپنے نظم وضبط (Morale and Discipline) کو قائم رکھا تو فتح یقینی ہے۔ اگر (خدانکردہ) انھوں نے خلفشار مچادیا اور مشکلات کو دیکھکر گھبرا اٹھے تو پھر محارب

حصے کے لئے دہری مصیبت ہو جائیگی۔ اسلئے قوم کیلئے یہ وقت بڑا نازک ہے جس میں خالی جذبات سے کہیں زیادہ غور و فکر، تدبر و تحمل اور حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس وقت یہ کاپیاں پریس میں جا رہی ہیں۔ جسوقت یہ چھپکر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچیں گی نہ معلوم اسوقت صورتِ حالات کیا ہو؟ لیکن جو صورتِ حالات بھی ہو حق کی حمایت کرنے والوں والوں کیلئے قرآن کی ہدایات ہر حالت کیلئے موجود ہیں۔ اگر حالتِ امن ہو تو اپنی حفاظتی تدابیر میں پوری پوری مستعدی اور امکان بھر قوت کا مہیا کرنا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (۸/۵۹)

جس قدر بھی تم میں قوت ہے اس کے مطابق دشمن کے مقابلہ کی تیاری رکھو۔ اپنی سرحدوں پر گھوڑوں (کے رسالے) تیار رکھو۔ تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمنوں کے دل میں تمہارا رعب قائم رہے۔ ان دشمنوں کے مقابلے کیلئے بھی جنہیں تم جانتے ہو اور ان کے مقابلے کیلئے بھی جو ابھی نکھر کر تمہارے سامنے نہیں آئے اسلئے تم انہیں نہیں جانتے۔ لیکن اللہ انہیں جانتا ہے۔

اور جب مقابلہ آن پڑے تو انفروا خفافاً و ثقالاً (۹/۴۱) ہلکے اور بھاری میدان جنگ میں اتر پڑو۔ اور وہاں فیقتلون و یقتلون۔ یا دشمن کو مغلوب کر لو یا خود جان دیدو۔

ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئۃ فقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جھنم وبئس المصیر (۸/۱۵)

اس دن جو شخص میدان جنگ سے پیٹھ پھیرے، بجز اس کے کہ وہ جنگ کیلئے پینترا بدل رہا ہو یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملنے کیلئے لوٹے۔ تو اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جگہ ہے ٹھکانے کی۔

اور اگر دشمن صلح کے لئے جھکے تو تم بھی صلح کیلئے تلواریں نیام میں کر لو (وان جنحوا للسلم فاجنح لھا)۔ یہ تو رہا محارب حصے کے متعلق۔ باقی رہی شہری آبادی۔ سو اس کے متعلق سب سے بڑی تاکید اس امر کی ہے کہ وہ یونہی غلط افواہوں پر کان دھر کر بھگدڑ نہ مچا دیں۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم ندمین (۴۹/۶)

اے ایمان والو۔ اگر تمہارے پاس کوئی فتنہ پرداز کسی قسم کی خبر لائے (تو اسے یونہی تسلیم نہ کر لیا کرو بلکہ) اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نادانی میں (اپنے کسی دوسرے) گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھو اور بعد میں اپنی اس حرکت پر پشیمان ہو۔

یہ ہیں جنگ کی صورت میں مختصر ہدایات ان کیلئے جو حق کی حفاظت کیلئے شمشیر بکف اٹھتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سرزمین پاکستان کی حفاظت کیلئے اٹھنا (کہ جس سرزمین کو قانونِ خداوندی کے نفاذ کا اولین محل بننا ہے) یکسر حق کی حفاظت کیلئے اٹھنا ہے۔ صرف ایک خطۂ زمین کی حفاظت کیلئے نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ اس خطۂ زمین کو اس لئے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس میں قرآنی نظام کی تشکیل کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے اس یقین کے ساتھ اٹھو تو تم میں سے ہر جان دینے والا المقتول فی سبیل اللہ (شہید) ہے اور ہر زندہ رہنے والا الغازی۔ اور اس آسمان کے نیچے ان سے بڑھ کر کسی اور کا مقام نہیں۔ واللہ علی ما نقول شھید۔

حُسنِ نظر

حائل تری طلب میں خیالِ اجل کہاں
یہ مقصدِ بلند ہے طولِ امل کہاں

ناصح تو دیکھتا ہی نہیں موقع و مقام
ہر بات ہر جگہ کے لئے برمحل کہاں

"کل" بھی تو "آج" بن کے گُل جائیگا یونہی
قبضے میں تیرے "آج" نہیں ہے تو "کل" کہاں

اے کم نظر اسے کسی قیمت پہ بھی نہ بیچ
دل ایک ہی تو چیز ہے اس کا بدل کہاں

شیریں ہوا ہے خسروِ پرویز کا دہن
پہنچا ہے کوہکن تری محنت کا پھل کہاں

زاہد شعورِ حُسن سے بیگانہ ہی رہا
حُسنِ نظر نہیں ہے تو حُسنِ عمل کہاں

ہر معصیت کو وجہِ فسادِ جہاں سمجھ
گو یہ خبر نہ ہو کہ پڑے گا خلل کہاں

تعریف ہو کہ طنز، یہ تھا اُن کا تبصرہ
پہنچائی ہے اسدؔ نے کہاں سے غزل کہاں

اسدؔ ملتانی

سلیم کے نام ۔۔۔

پرویز

ہاں سلیم! تمہاری اطلاع درست تھی۔ میں پچھلے دنوں اچھا نہیں رہا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ۱۹۴۲ء میں مجھے لُو لگ گئی تھی۔ اس کے بعد آجتک میری حالت یہ ہے کہ ذرا سی گرم ہوا بھی اثر کر جاتی ہے۔ اگلے دنوں یہی ہوا۔ ایک رات سخت تکلیف رہی۔ درد سے تڑپتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا دوائیوں کا بکس میرے سرہانے رکھا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ اس کے لئے کونسی دوائی چاہیئے۔ صبح وہ آئے اور اسی ڈبے میں سے ایک دوائی نکال کر دی جس سے فوراً آرام ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے مصائب و نوائب کا شکار ہو رہے ہیں، مختلف نوعیتوں کے درد اور آلام میں مبتلا ہیں۔ قرآن ان کے سرہانے رکھا رہتا ہے لیکن انھیں معلوم نہیں کہ اس نسخہ کا استعمال کیسے کیا جائے۔ "نیم حکیموں" کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ نہ شفا ہوتی ہے نہ رہائی۔ ورنہ اگر یہ کبھی قرآن کھول کر دیکھ لیتے تو اس میں سے انھیں شفا کا نسخہ اس طرح مل جاتا جس طرح برادرانِ حضرت یوسفؑ کو بوریوں میں سے اپنی پونجی مل گئی تھی۔ لما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم۔

کیسی بدبختی ہے سلیم! اس مریض کی جو تڑپ تڑپ کر جان دیدے درآنحالیکہ دوائیوں کا بکس اس کے سرہانے رکھا ہو!

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے "فطرت اللہ" کا صحیح مفہوم سمجھ لیا۔ ورنہ وہ بات مشکل بھی تھی اور روشِ عامہ سے ہٹی ہوئی بھی۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید اتنی جلدی تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔ دیکھا تم نے سلیم! ایک بات کے واضح ہو جانے سے کتنی اور باتیں خود بخود صاف ہو جاتی ہیں؟ قرآن فی الواقعہ بہت آسان ہے (ولقد یسرنا القرآن للذکر) بشرطیکہ اسے سلیقے سے سمجھا جائے اور اگر اسے چیستان بنا دیا جائے تو پھر اس میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ مُلّا بچارے کے اٹھارہ علوم تو ایک طرف، دنیا بھر کے علوم زندگی کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتے۔ لیکن یہ گتھیاں خود ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ خود ہی اندر سے کواڑ بند کر رکھا ہے اور خود ہی رو رہے ہیں کہ باہر کیسے نکلیں۔ ہاتھ بڑھاؤ کواڑ کھولو۔ باہر نکلنے کا راستہ خود بخود کھل جائیگا۔

تم نے ٹھیک سمجھا ہے کہ خدا کا جو قانون تخلیق عالم آفاق میں کارفرما ہے وہی انسان کی دنیا میں نافذ العمل ہے، اس فرق کے ساتھ۔ کہ وہاں یہ قانون از خود کارفرما ہے اور یہاں انسان کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے کوئی دوسرا

قانون اختیار کرلے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہی ہے جو حیوانات سے متعلق ہے یعنی انسان کی طبعی زندگی۔ اس میں بدیہی طور پر وہی قانون کارفرما ہے جو عام حیوانات میں جاری وساری ہے۔ حیوانات ہی کی طرح اس کی زندگی کا دارومدار بھی ہوا اور غذا پر ہے۔ سونا اور جاگنا بھی انہی کی طرح ہے۔ اس کے جسم کی مشینری بھی اسی طرح چلتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق یہ زندہ رہتا ہے اور اسی کے مطابق مرجاتا ہے۔ لہٰذا جسقدر معاملات اس کی طبعی زندگی سے متعلق ہیں وہ اس کی انسانی زندگی نہیں بلکہ حیوانی زندگی کا حصہ ہیں۔ لیکن اس نے اس حصۂ زندگی میں بھی اپنے لئے اس قدر مصیبتیں پیدا کرلی ہیں کہ وہ مسائل جو حیوانات کی زندگی میں کوئی معنی ہی نہیں رکھتے، اس کیلئے زندگی کی اہم ترین مشکلات (Problems) بن گئے ہیں۔ جنگل کے جانوروں کو یہ سوچنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ آج کھائیں گے کیا اور رات کو رہیں گے کہاں؟ ہم بیمار پڑیں گے تو دوائی کون لاکر دیگا اور مرگئے تو بچوں کی دیکھ بھال کون کریگا؟ ان میں سے کسی کو اس کی فکر نہیں ستاتی۔ لیکن یہ حضرتِ اشرف المخلوقات ہیں کہ ان کی زندگی کی ساری تگ وتاز انہی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہوجاتی ہے اور یہ اس پر بھی سلجھنے میں نہیں آتیں۔ ذرا غور کرو سلیم! آج ساری دنیا انہی خود پیدا کردہ مسائل کے حل کرنے میں لگ رہی ہے اور مسائل ہیں کہ جسقدر حل کرو اور پیچیدہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے کسی حد تک کھانے پینے کے مسئلہ کا حل پالیا ہے۔ وہ اسے انسانیت کا منتہائے کمال سمجھتے ہیں اور زندگی کی معراج۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اتنا بھی نہیں کرپائے اُن کے مقابلے میں یہ لوگ اپنی اس کاوش پر بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اس سے انسانیت کے مسائل حل ہوگئے؟ کیا انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہ مسائل انسانی زندگی کے اس حصہ سے متعلق ہیں جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہو کہ اس سے انسان کی حیوانی زندگی کے مسائل حل ہوگئے! انسانی زندگی کو تو اس نے ابھی چھوا تک بھی نہیں۔ وہ مقام اس سے آگے ہے۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے معاشی پہلو (طبعی زندگی سے متعلق مسائل) کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اس کی انسانی زندگی کے نشوونما اور ارتقا و بالیدگی کا نظام بھی متشکل کرتا ہے۔ خدا کا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) ان تمام مسائلِ حیات کو محیط ہے۔

میں نے تمہیں پچھلے خط میں بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ تخلیق کی ایک شق یہ ہے کہ ہر شے میں کچھ امکانی قوتیں ودیعت کرکے رکھدی گئی ہیں اور ان مضمر قوتوں کے نشوونما کے بعد انھیں تکمیل تک پہنچانا، ان اشیاء کا مقصودِ حیات ہے۔ (اسے قانونِ ربوبیت کہا جاتا ہے)۔ بڑ کے ایک ننھے سے بیج کو دیکھو۔ اس میں کتنی عظیم القدر قوتیں مضمر ہوتی ہیں! اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ کونپل پودا بنتی ہے۔ پودا بڑھ کر پیڑ بنتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک تناور بڑ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں پھل لگتا ہے جس کے اندر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ویسے ہی ننھے ننھے بیج ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر بیج اسی قسم کا بڑ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ عالمِ آفاق میں یہ لامتناہی سلسلہ جاری وساری ہے۔

بڑے کے بیج کا بڑ بن جانا، اس کا مقصودِ حیات ہے، یہی اس کی صلاحیتوں کا پیمانہ ہے، اسی کو اس کی تقدیر کہتے ہیں۔ وہ اگر اس انتہا تک نہیں پہنچتا، تو اپنے مقصدِ حیات میں ناکام رہ جاتا ہے۔ اس کی مضمر قوتیں، تمام و کمال مشہود نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ اپنے آخری مقام سے آگے بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ اس میں اس سے آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ آخری مقام اس کی منزلِ مقصود ہے۔ اس کی سعی و کاوش کا رُخ اسی آخری مقام کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی تمام تگ و تاز اسی نہج پر ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ

پھر اس پر بھی غور کرو سلیم! کہ مختلف اشیاء کی امکانی وسعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ تمہاری کوٹھی کی باڑ کس قدر خوبصورت ہے۔ لیکن اس بیل میں نہ پھول آتے ہیں نہ پھل۔ پتوں کی تر و تازگی اس کی آخری منزل ہے۔ اس کے ساتھ ہی چنبیلی کی شاخیں ہیں کہ بہار میں ہر شاخ عطر بیز اور عنبر فشاں بن جاتی ہے۔ لیکن اس کی منزل بھی پتوں اور پھولوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس سے آگے بڑھو تو آم کے پیڑ ہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! انگبیں کے ہیں سر بمہر گلاس۔ (میرا خیال ہے سلیم! غالب کی رسائی سردلی تک ہی ہوئی ہوگی۔ اسی لئے تشبیہ شہد تک رک کر رہ گئی۔ اگر کہیں چوسا بھی مل جاتا تو معلوم میرزا صاحب کیا کیا کہتے اور اس پر بھی اطمینان نہ ہوتا کہ تشبیہ تام ہے۔ آم کو "انگبیں کے گلاس" کہنا، میرے نزدیک آم کی بے حرمتی ہے، اور اگر میرزا کی روح معاف کر دے تو مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اپنی بے ذوقی کا ثبوت۔ کہاں آم کہاں شہد۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنوا تیلی۔ آم کے متعلق تو سوائے اس کے کہ آدمی یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ "اما تو چیزے دیگری" اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں)۔

ان سے آگے ببول ہے کہ بچارے کا منتہائے کمال چند کانٹے ہیں جو قیسِ عامری کے لباسِ برہنگی کی بخیہ گری کرتے یا اس کی صحرانوردیوں میں سامانِ آبلہ شکنی بنتے ہیں۔ لیکن پتے ہوں یا پھل، پھول ہوں یا کانٹے، کامیاب درخت وہی کہلاتا ہے جو اپنے انتہائی مقام تک جا پہنچے۔ جو راستہ میں سوکھ جائے وہ کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی مضمر قوتیں بہ تمام و کمال نشو و نما نہیں پاتیں۔ اس کی ممکناتِ زندگی تزکیہ یاب نہیں ہوتیں۔ وہ (Un-developed) رہ جاتی ہیں۔ قد افلح من زکٰھا وقد خاب من دسّٰھا۔ جو بیج نشو و نما پا گیا اس کی کھیتی پک گئی۔ جو مٹی کے تودے کے نیچے دب کر رہ گیا وہ نامراد رہا۔ لہٰذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی پہلی شق یہ ہے کہ ہر شے کی مضمر قوتیں اسکی آخری منزل تک نشو و نما پا کر مشہود ہو جائیں۔ چونکہ انسان کی خلقت بھی اسی قانونِ تخلیق کے مطابق ہوتی ہے۔ (فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا) اس لئے جس انسان کی مضمر صلاحیتیں بہ تمام و کمال نشو و نما پا گئیں وہ شقِ اول کے اعتبار سے، کامیاب ہوگیا۔ جس کی صلاحیتیں دب کر رہ گئیں وہ ناکام رہا۔ زندگی کی علامت ذوقِ نمود اور اس کا معراج اس کے مضمر جوہروں کی برومندی اور ثمرباری ہے۔ رشکِ صد فردوس ہے وہ معاشرہ جس میں یہ شادابیاں اور سیرابیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔ (تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا) اور جہنم کی آگ ہے وہ ماحول جس میں یہ سرسبز شاخیں سوکھ کر متحجر ہو جائیں (وقودھا الناس والحجارۃ)۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو اور دیکھو کہ ایک ننھا سا بیج کس طرح تناور درخت بن جاتا ہے۔ بیج کو میز پر رکھ چھوڑو۔ اس میں قیامت تک آثار نمود دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کیلئے اسے مٹی میں ملانا ہوگا۔ مٹی میں نمی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر اسے حرارت بھی درکار ہے۔

اس کے بعد ہوا بھی۔ آب و خاک و باد و نار کے امتزاج سے بیج میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے ان عناصر کا باہمی تعاون ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی ایک درجہ آگے، ائتلاف کی شکل پیدا ہو جاتی ہے یعنی یہ تمام عناصر اپنے آپ کو بیج کے اندر جذب کر دیتے ہیں اور جسے ہم کونپل کہتے ہیں وہ درحقیقت انہی عناصر کی ترتیب یافتہ شکل ہوتی ہے۔ ان تمام عناصر کو الگ الگ رکھئے، کسی میں بالیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ جب یہ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیں گے تو ہر ایک میں جوشِ نمو ابھر آئیگا۔ جسے ہم پھل کہتے ہیں وہ تنہا بیج کی ارتقا یافتہ صورت نہیں ہوتی۔ نہ معلوم اس میں کسقدر مٹی کے نمک، پانی، ہوا اور حرارت کے مرکبات باہمد گر مدغم ہوتے ہیں پھل، گویا ان سب کی ارتقا یافتہ شکل کا نام ہے۔ جو سینکڑوں گردشوں کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

لہٰذہ، قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی دوسری شق یہ ہے کہ کوئی قوت انفرادی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے نشوونما نہیں پا سکتی۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ دوسری قوتیں بھی اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر دیں اور اس طرح یہ تمام قوتیں ایک دوسرے میں سمو کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ نشوونما (Development) کا راز ربط باہمی میں ہے۔

انسانی زندگی میں اس ربط باہمی کا نام اجتماعی نظام یا معاشرہ ہے۔ جس نظم کے ماتحت یہ اجتماعی نظام وجود میں آتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں اُسے الدین کہا جاتا ہے۔ قانونِ تخلیق کی اس شق کے مطابق، افرادِ انسانیہ، انفرادی طور پر اپنی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دے ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی صلاحیتوں کو ایک کُل میں سمو دیں۔ (الف بین قلوبکم) اور اس عمل ائتلاف سے نشوو ارتقا کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ اس کل کا نام امت، یا ملت یا جماعت ہے۔ یہ کُل ان افراد کی قوتوں میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لیتا۔ اس کا دراصل الگ وجود ہی نہیں ہوتا، جس طرح مشین پرزوں کے مجموعہ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن مشین کی مجموعی قوت یا تخلیقی نتیجہ (Creative outcome) پرزوں کی مجموعی قوت سے زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مشین میں قوت کی یہ زیادتی کہاں سے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا یہ دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس نظم (Order) کا جس میں وہ پرزے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان پرزوں سے اس نظم کو الگ کر دیجئے، ان کی تمام قوت معدوم ہو جائے گی۔ وہ نظم جو افراد (کے پرزوں) کو جماعت (کی مشین) کی صورت میں تشکل کر دیتا ہے الدین کہلاتا ہے۔ "دیندار" وہ افراد ہیں جو نظم باہمی سے جماعت (مشین) کی صورت میں مربوط ہو جائیں اور اس طرح ان کی ہر حرکت ایک خاص نتیجہ پیدا کرے۔ پرزوں کی اس ہم آہنگی (ایک قانون کے تابع نقل و حرکت) کو اسلام کہتے ہیں۔ جب چار چار گھوڑے اکٹھے چلیں اور اس طرح کہ ان کے قدم ایک ساتھ اٹھیں اور ایک ساتھ جھکیں تو اسے تسالُم کہتے ہیں۔ اسی سے اسلام کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں یعنی "وارکعوا مع الراکعین"۔

میں نے پرزوں اور مشین کی مثال محض سمجھانے کی خاطر دی ہے ورنہ افراد کے نظم و ضبط باہمی کا تعلق پرزوں کے ربط و ترتیب سے مختلف اور بلند ہوتا ہے۔ پرزوں کا ربط زیادہ سے زیادہ تعاون کہلاتا ہے لیکن مُسلم افراد کا ربط باہمی، ائتلاف کہلاتا ہے (الف بین

قلوبکم) یعنی اس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو جانا جس طرح ایک بادل دوسرے بادل میں سمو جاتا ہے۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اور یک رنگی کی یہ آخری منزل ہے جسے تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ فلاحت (لعلکم تفلحون) کھیتی کے بارآور ہونے (بیج کے درخت بنکر ثمر بار ہو جانے) کے لئے اس قسم کا ارتباط و ائتلاف ناگزیر ہے۔ اس میں ہر فرد دوسرے افراد کی ربوبیت (پانی کے قطرہ کے موتی بن جانے) کا سامان بنکر خود اپنی نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے جس طرح مٹی اور پانی حرارت اور ہوا بیج کی ربوبیت کا ذریعہ بن کر درحقیقت خود اپنی نشوونما کا موجب بنتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کون کس کی ربوبیت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ تمام افراد اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کو ایک مشترک منزل کے حصول کیلئے روبعمل لاتے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی صلاحیتیں نشوونما پاکر خود بخود (Develop) ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی کا نام مساعی کا مشکور ہو جانا ہے (وکان سعیکم مشکورا) شکر کے معنی ہیں بکری کے تھنوں کا اس طرح دودھ سے بھر جانا کہ نظر آئے کہ دودھ اب ٹپکا کہ ٹپکا۔ افراد کی محنتیں (سعیکم) اسی طرح "مشکور" (Fully Develop) ہوتی ہیں۔

قانونِ تخلیق خداوندی (فطرت اللہ) کی یہ دوسری شق ہے۔ اس کے بغیر امکانی صلاحیتیں کبھی نشوونما نہیں پا سکتیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بیج کی نشوونما کے لئے مختلف اور متضاد قوتوں کے باہمی امتزاج و ادغام کی ضرورت ہے۔ پانی اور حرارت، ہوا اور مٹی، سب کا باہمی امتزاج۔ لیکن اس کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرو۔ آغوشِ خاک، بیج کے لئے سامانِ زیست ہے۔ لیکن یہی مٹی اگر ذرا زیادہ مقدار میں بیج کے اوپر آجائے تو اس سے بیج کا گلا گھٹ جاتا ہے اور وہیں دب کر رہ جاتا ہے۔ پانی، کونپل اور پودے کیلئے ذریعۂ حیات ہے لیکن اگر پانی ذرا بھی اپنی حد سے بڑھ جائے تو پودے کی کشتِ حیات اس میں غرق ہو جاتی ہے۔ حرارت کے بغیر رگِ تاک میں آثارِ حیات معدوم ہوتے ہیں لیکن یہی حرارت اگر ایک قدم آگے بڑھ جائے تو ہری بھری کھیتیوں کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ ہوا ہر پودے کیلئے نفسِ حیات ہے لیکن اسی ہوا کی تیزی اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان متضاد عناصر کا باہمی ارتباط و امتزاج ہی ضروری نہیں بلکہ اس امتزاج کے لئے ایک خاص توازن و تناسب بھی لاینفک ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا، نہ صرف نشوونما رک گئی بلکہ بیج کی تمام امکانی قوتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

اعتدال اور تناسب کے ساتھ ہی ایک چیز موقعہ اور محل بھی ہے۔ پودے کی برومندی کیلئے کبھی حرارت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کبھی ٹھنڈک کی۔ کبھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے کبھی خشکی کی۔ موسم اور بے موسم کی کاشت اس فرق کا مظہر ہوتی ہے۔ لہٰذا قانونِ تخلیق کی تیسری شق یہ ہے کہ مختلف قوتوں میں خاص تناسب قائم رہے اور جس وقت جس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہو

اس وقت وہی قوت اپنے خاص توازن کو لئے ہوئے، بروئے کار آئے۔

انسانی زندگی میں متضاد قوتوں کا تصادم ایک تو ہر فرد کے اپنے سینے میں ہوتا ہے اور دوسرے مختلف افراد میں باہمد گر۔ متضاد قوتوں کی کشمکش جو انسان کے اپنے سینے میں موجزن ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ گہری اور شدید ہوتی ہے جو دو افراد کے درمیان وجہ کشاکش ہوتی ہے۔ افراد کی متضاد قوتوں کی کشاکش محسوس اور مشہود ہوتی ہے، اس لئے انھیں اس کا علم بدیہی طور پر ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن قوتوں کی رزمگاہ انسان کا اپنا سینہ ہوتا ہے وہ بڑی غیر محسوس اور یکسر غیر مرئی ہوتی ہیں، اس لئے ان کا تضاد بدیہی طور پر نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان، دوسروں کے فریب کے مقابلہ میں خود اپنے نفس کے فریب میں بہت جلد آ جاتا ہے اور بہت دیر تک اس سے نکلنے نہیں پاتا۔

متضاد قوتوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے عدم توازن سے۔ اگر ان میں توازن قائم رہے تو ان کی باہمی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور وہ باہمی امتزاج و ائتلاف سے وجہ بالیدگی نفس بن جاتی ہے۔ یعنی خود اپنے نشوونما کا ذریعہ۔ اس توازن قائم رکھنے کا نام "حسن عمل" ہے۔ سلیم! تم جانتے ہو کہ "حسن" کسے کہتے ہیں؟ حسن، صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے[1]۔ کسی شے کے مختلف اجزا میں جس قدر صحیح تناسب ہوگا وہ اتنی ہی حسین کہلائے گی اور جب وہ تناسب اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گا تو وہ شے جمالیاتی معراج تک جا پہنچے گی۔ تاج محل کا حسن، کہ جسے دیکھکر تم نے کہا تھا کہ جی چاہتا ہے اسے گلے لگا لوں اور خوب زور سے بھینچوں اس کے تناسب کے سوا اور کیا ہے؟ اس میں تناسب اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا حسن بے مثال ہو گیا ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کہ جس کے متعلق حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ وہ تو "بیگم" ہے، اسی صحت تناسب سے حسن مجسم بن گئی ہے۔ یہی تناسب جب انسان کی مضر قوتوں میں رونما ہوتا ہے تو اسے قرآن "حسنات" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی ضد "سیئات" ہے جس کے معنی تناسب کا بگاڑ ہیں۔ جب ان قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہے۔ جب توازن بگڑ جائے تو اسے شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی قوتوں میں سے کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ہے نہ شر۔ انسان کی امکانی قوتوں میں سے ہر قوت، حصولِ مقصدِ حیات کے لئے ضروری ہے اس لئے ان تمام قوتوں کی کامل نشوونما لاینفک۔ اس نشوونما کے بعد، جب ان قوتوں میں باہمی تناسب پیدا ہو جائے تو وہ وجہ ربوبیت بن جاتی ہیں۔ اس کا نام خیر ہے۔ جب ان کا تناسب بگڑ جائے تو وہ باعث تخریب ہو جاتی ہے اسے شر کہا جاتا ہے۔ گویا ہر شے کی ایک شری کیفیت ہوتی ہے اور ایک خیر کی حالت۔ خیر کی حالت وہ ہے جب اس میں توازن و اعتدال ہو۔ شر کی حالت وہ جس میں توازن بگڑ جائے۔ ایک گلاس پانی باعث حیات ہے۔ یہ اس کی خیر کی کیفیت ہے۔ لیکن وہی پانی جب اپنے اعتدال سے بڑھ جائے اور انسان اس میں ڈوب جائے تو موجب ہلاکت ہو جاتا ہے۔ یہ پانی کی شری کیفیت ہے۔ لہٰذا پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہے نہ شر۔

---

[1] اس اجمال کی تفصیل میرے مقالہ "اسباب زوال امت" میں آ چکی ہے۔

اس میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ یہی حالت کائنات کی ہر شے کی ہے۔ خدا کا قانون یہ سکھاتا ہے کہ ہمیشہ اشیائے کائنات کے خیر کے پہلو سے متمتع ہو اور شر کے پہلو سے مجتنب رہو۔ غور کرو سلیم! "قل اعوذ برب الفلق۔ من شر ما خلق" میں پناہ مانگی ہے "ما خلق" (اشیائے کائنات) کے شری پہلو سے۔ کائنات اور انسان کی مختلف قوتوں میں صحیح تناسب قانونِ خداوندی کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی آفاقی اور انسانی قوتیں قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہوں گی، تو ان کا خیری کا پہلو مشہود ہوگا۔ (بیدِکَ الخیر)۔ انسان کے صحیح اختیار کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ معاشرہ میں خیر کے پہلو کو سامنے لائے (خیر اور اختیار ایک ہی بات ہے)

جب افراد کے اندر مضمر قوتوں کی نشوونما بطریقِ احسن ہوتی ہے اور ان میں صحیح صحیح تناسب بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے انسان کی اپنی ذات پر جو کیفیت مرتب ہوتی ہے اسے قرآن نے "اطمینانِ قلب" سے تعبیر کیا ہے۔ اطمینان کسی سلبی کیفیت (Negative Condition) کا نام نہیں۔ یہ ایک ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے۔ مثلاً جب انسان کی تندرستی ٹھیک ہو اور اسے کسی قسم کا فکر بھی دامنگیر نہ ہو، اس میں ایک عجیب قسم کے بھاری بھرکم، ثقاہت اور متانت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جسے یہ نصیب ہوتی ہے وہ اس کے سرور سے کیف اندوز ہوتا ہے اور دوسرے لوگ صرف اس کے مظاہر سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان کی مضمر قوتیں پورے نشوونما کے بعد، متناسب و متوازن ہو جائیں اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو اسے دوسرے انسانوں سے نمایاں طور پر متمیز کر دیتی ہے۔ اسی کو قرآن مومن کا امتیازی نشان قرار دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ کیفیت انفرادی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انسانی مضمر قوتوں کی نشوونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کیلئے اسے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جس اطمینان قلب کو کسی انفرادی عمل کا نتیجہ بتایا جائے وہ خواب آور افسون ہوتا ہے۔

جس طرح ایک فرد کی زندگی کی مضمر قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب ناگزیر ہے، اسی طرح، افراد کے مجموعہ یعنی معاشرہ (اجتماعی زندگی) میں مختلف افراد کی صلاحیتوں میں تناسب نہایت ضروری ہے۔ جب کسی معاشرہ میں یہ تناسب قائم ہو جاتا ہے تو اسے "اصلاح" کی حالت کہتے ہیں اور جب یہ تناسب بگڑ جاتا ہے تو اسے حالتِ "فساد" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصلاح کے معنی ہیں ہمواری اور فساد کے معنی ناہمواری۔ "مصلحین" معاشرہ کے ان افراد کا نام ہے جن میں اس قسم کا تناسب و توازن قائم رہتا ہے۔ مفسدین انہیں کہتے ہیں جن میں یہ توازن موجود نہیں ہوتا۔ اصلاح کا نتیجہ اجتماعی ربوبیت ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں تمام افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کے کامل نشوونما کا سامان موجود ہوتا ہے (یعنی اس قسم کا معاشرہ خود ہی اس نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے)۔ اس کے برعکس "مفسدین" کے معاشرہ میں بڑی ناہمواریاں ہوتی ہیں اور اجتماعی ربوبیت کے بجائے ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔

دوسری چیز موقعہ اور محل کا سوال ہے۔ یعنی ان قوتوں کی نشوونما کے بعد، اس چیز کا صحیح صحیح فیصلہ کہ کس موقعہ پر کس قسم کی

قوت کا ردِ عمل آنا ضروری ہے۔ قرآن اس قسم کی قوتِ تمیز کو "بصیرت" سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مردانِ مومن کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اولی الایدی والابصار۔ صاحبانِ قوت و بصیرت ہوتے ہیں۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن جتنا کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے پہلے اُسے اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو، پھر بات آگے چلے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کہانی کہتا چلا جاؤں اور تم بابا فتے خاں کی طرح سوتے میں ہی "ہوں ہوں" کرتے رہو۔ تم سلیم، بابا فتے خاں پر تو ہنسا کرتے تھے لیکن اگر غور کرو تو دنیا میں اکثریت فتے خانوں ہی کی پاؤ گے۔ سو رہے ہیں اور "ہوں ہوں" کر رہے ہیں۔ بات سمجھنے والے بہت کم دکھائی دیں گے۔ اور پھر جب تم بات بھی ایسی چھیڑو جو دنیا جہان سے نرالی ہو تو اس پر کان دھرنے والے کتنے مل سکیں گے؟ ایک وہ تھے جو کہتے تھے کہ

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ ؎ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اور ایک ہم ہیں کہ کہانی کہہ رہے ہیں اور اول تو اسے سننے والے ہی نہیں ملتے، اور جو سن کر "ہنکارا" بھر رہے ہیں ان کے متعلق بھی شبہ ہے کہ معلوم جاگ رہے ہیں یا سوتے ہی میں 'ہوں ہوں' کئے جا رہے ہیں! بہرحال تمہارا تقاضا ہوتا ہے تو میں کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اب سننا سنانا تمہارا کام ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا کے جس قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق انسان کی تخلیق ہوتی ہے اس کے مطابق

(۱) مقصود تگ و تاز یہ ہے کہ ہر انسان کی امکانی وسعتوں (Human Faculties) کی پوری پوری نشوونما (Development) ہو جائے۔

(۲) یہ نشوونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے لئے نظامِ اجتماعی لاینفک ہے۔

(۳) اور نظامِ اجتماعی میں ان کی صحیح نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے جب ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب قائم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کس موقعہ پر کس قسم کی قوت روبعمل آنی چاہئے۔

اب آگے بڑھو۔ عالم آفاق (باہر کی دنیا) میں خدا کا قانون اس طرح کارفرما ہے کہ کائنات کی متضاد قوتوں میں کبھی تصادم واقعہ نہیں ہوتا۔ ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب بھی قائم رہتا ہے اور جہاں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ قوت اتنی ہی مقدار میں بروئے کار آجاتی ہے۔ 'کل لہٗ قانتون' کے یہی معنی ہیں: "سقاء قنیت" اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو اس طرح احتیاط سے سیا جائے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی از خود ٹپکے اور اس کا منہ اس تدبیر سے باندھا جائے کہ جہاں جس قدر ضرورت ہو وہاں اتنا ہی پانی اس میں سے باہر آئے۔ اس تصریح کے بعد سلیم! غور کرو کہ قرآن نے جب عالم آفاق کی مختلف اشیاء کے متعلق فرمایا ہے کہ کل لہٗ قانتون (سب کی سب خدا کے قانون کے لئے سقاء قنیت کی طرح ہیں) تو اس نے کارگہ عالم کے نظم و نسق کا کیا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ ہر شے "اپنے

جوہرِ مضمر کی کامل نشوونما سے اس مشکیزے کی طرح لٹکی ہوئی جو پانی سے لبالب بھرا ہوا اور اپنی قوتوں کو اس انداز سے محفوظ رکھے ہوئے کہ ایک قطرہ بھی بے موقعہ و محل ضائع نہ ہو، اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس طرح لب کشا کہ ہر ایک، اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیر ہو جائے۔ کل لہٗ قانتون۔

لیکن سلیم! انسان کی دنیا میں یہ قانون اس طرح نافذ العمل نہیں ہے۔ انسان کو آزادی حاصل ہے۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس نے راہ اور بے راہروی اپنے فیصلے سے اختیار کرنی ہے۔ اس باب میں انسان نے اپنی عقل کی رو سے کیا فیصلہ کیا، یہ داستان دلخراش بھی ہے اور تبسم ریز بھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے اندر بعض قوتیں شر کا موجب ہیں اس لئے ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں دبا دیا جائے۔ اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ انسان کی ساری تاریخ اسی لفظ "دبانے" (Suppression) ہی کی تفصیل ہے۔ انفرادی دنیا میں یہ "دبانا" رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ رہبانیت کیا ہے؟ ان قوتوں کے دبانے (اور دبا کر بالآخر انہیں بزعم خویش فنا کر دینے) کا فلسفہ اور عمل۔ لیکن یہ انسان کی بھول تھی۔ انسان کے اندر نہ تو کوئی ایسی قوت ہے جو بجائے خویش شر انگیز ہے اور نہ ہی انسانی قوتیں دبانے سے فنا ہوتی ہیں۔ انہیں ایک طرف سے دبائیے تو نامعلوم کتنے غیر معلوم "چور دروازوں" کے راستے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہٰذا رہبانیت (جو آگے چل کر خانقاہیت اور تصوف کے نام سے منصۂ شہود پر آئی) انسان کی غلط نگہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ تو تھا انسان کی انفرادی زندگی کے متعلق۔ اس کی اجتماعی زندگی میں یہی "دبانے" کا عمل، استبداد و ملوکیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ استبداد پسند انسانوں نے جب دیکھا کہ فلاں فلاں قوتیں ان کے مفاد کی راہ میں حائل ہیں، تو انہوں نے ان قوتوں کو دبانے اور دبا کر فنا کر دینے کی تدابیر سوچنی شروع کر دیں۔ (قانونِ خداوندی کے بجائے) انسانی ہاتھوں کا تراشیدہ نظامِ حکمرانی اسی "دباؤ کے عمل" کی منظم شکل ہے۔ نام مختلف ہیں۔ صورتیں بھی متنوع ہیں۔ لیکن روح ہر جگہ وہی کارفرما ہے۔ اس مقصد کیلئے انسان نے "عہدِ جاہلیت" میں لوہے کے شکنجے وضع کر رکھے تھے۔ اب تہذیب و تمدن کا دور ہے اس لئے آہنی شکنجوں کی جگہ آئینی شکنجوں نے لے لی ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ تم نے پڑھا ہوگا سلیم! جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر کے خلیفہ کو گرفتار کر لیا تو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ خلیفہ کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ہلاکو خاں نے کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مشیروں نے اس سے کہا کہ مسلمانوں میں خلیفہ کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بڑی مقدس۔ ہم نے سنا ہے کہ اگر خلیفہ کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر جائے تو زمین شق ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خلیفہ کی خونریزی خطرہ سے خالی نہیں۔ اس پر ہلاکو متردد ہوا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ چنانچہ حل یہ سوچا گیا کہ خلیفہ کو بڑے بڑے نمدوں میں لپیٹ کر کچل دیا جائے تاکہ اس کے مقدس خون کا کوئی قطرہ زمین پر گرنے نہ پائے۔ انسان کے دورِ جاہلیت اور زمانۂ تہذیب میں، سلیم! بس اتنا ہی فرق ہے۔ "دباؤ" کے استبدادی شکنجے اب بھی وہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اب کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جسے کچلا جائے اس کے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی نہ دیں۔

قرآن نے آکر کہا کہ یہ "دبانے کا عمل" یکسر غلط ہے۔ نہ رہبانیت کا دباؤ درست ہے نہ ملوکیت کا۔ قد خاب من دسھا جس نے نفس انسانی کو دبایا وہ تباہ ہوگیا۔ اسے یہ قوتیں دبائے اور کچلے جانے کے لئے نہیں دی گئیں۔ انسان یونہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آگیا کہ اس میں کارآمد اشیاء کے ساتھ ساتھ کچھ مضر عناصر بھی رہ گئے ہوں جنھیں تباہ کرنا ضروری ہے۔ اس کی تخلیق، خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق عمل میں آئی ہے اور خدا کا قانون ایسا ناقص نہیں کہ وہ مفید کے ساتھ مضر اور خیر کے ساتھ شر کو بھی لگا رہنے دے۔ اور اس کے بعد اس کی ایسی "صفائی" (تزکیہ) کی ضرورت پڑے کہ مضر کو مفید اور شر کو خیر سے الگ کر دیا جائے۔ تزکیہ نفس کا یہ تصور تمہارا خود تراشیدہ اور رہبانیت کا پیدا کردہ ہے۔ تزکیۂ نفس کے معنی انسان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ وقد افلح من زکھا۔ اسی کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو ان قوتوں کو کامل نشوونما دیتا ہے۔ فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تم ان کا تناسب بگاڑ دیتے ہو معاشرہ (Society) کے مختلف افراد کی صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن (Balance) قائم رکھنا ہی معاشرہ کا حسن ہے۔ قیام تناسب کا نام احسان ہے (یعنی حسن قائم کرنا) افراد کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا رخ اس طرف پھیر دینا جہاں ان صلاحیتوں کی کمی ہے اور اس طرح معاشرہ میں ہمواری پیدا کر دینا۔ اسلامی معاشرہ میں، مرکزِ امت اسی قسم کی ہمواریاں پیدا کرتا ہے اور اس طرح تمام افراد معاشرہ کی مضر قوتوں کی ربوبیت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ نہ بڑھی ہوئی قوتیں بے جا مصرف سے موجبِ تخریب بنتی ہیں، نہ پیچھے رہ جانے والے اعضا سامانِ ربوبیت کی کمی سے مرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کیا ہوتا ہے، یوں سمجھو کہ ایک (Blood Bank) ہوتا ہے جو ان افراد سے خون لیکر جہاں اس کی زیادتی سے رگیں پھٹ جانے کا احتمال ہو، ان جسموں میں داخل کر دیتا ہے۔ جو کمی خون کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہوں۔ اس سے اول الذکر افراد کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ثانی الذکر میں احسان (یعنی کمی کو پورا کر کے تناسب کا قیام)۔ اس طرح سے معاشرہ کی تشکیل عدل و احسان کی رو سے قائم ہو جاتی ہے (ان اللہ یامر بالعدل والاحسان)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(i) انسان کو کیسے معلوم ہو کہ اس کے اندر کون کونسی قوتیں مضر ہیں جن کا تزکیہ (نشوونما) ضروری ہے۔

(ii) ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھا جائے۔

(iii) اور یہ کیسے معلوم ہو کہ کس موقعہ پر کس قوت کا مظاہرہ ضروری ہے۔

شق (i) کیلئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے کوئی خارجی معیار (Objective standard) ہو جس سے وہ ان قوتوں کا اندازہ کرتا جائے۔ وہ معیار، قرآن کی رو سے، ذاتِ خداوندی (اللہ) ہے۔ اللہ کی جو صفات قرآن میں مذکور ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک کو صفات طبعی (Physical attributes) کہئے اور دوسری کو صفات اخلاقی (Ethical attributes)

مثلاً ھوالاول میں صفتِ اولیت پہلی قسم کی ہے۔ یہ صفات بہت تھوڑی سی ہیں۔ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔ اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے رنگ سے زیادہ متناسب اور متوازن رنگ اور کونسا ہوگا۔ یہ وہ تمام قوتیں ہیں جو انسان کے اندر مضمر ہیں اور جن کی نشوونما بدرجہ اتم (Maximun Development) اس کی زندگی کا مقصود ہے۔ یہ ہے وہ خارجی معیار جس کے مطابق یہ دیکھنا چاہئے کہ انسان کے اندر کن کن صفات (قوتوں) کی نشوونما کا امکان ہے اور ان کی نشوونما کس حد تک ہو رہی ہے۔ اللہ اُس آئیڈیل کا نام ہے جس میں یہ تمام صفات اپنے انتہائی نقطہ تک تکمیل یافتہ ہیں اور ایک ایسے تناسب و توازن سے سموئی ہوئی ہیں جس سے بہتر تناسب تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ لہٰذا الاسماء الحسنیٰ۔ باقی رہا یہ کہ انسان اپنی ذات اور اپنے معاشرہ میں ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھے، سو اس کا ذریعہ قرآنی اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی کس حد تک بڑھا جائے اور کہاں پہنچکر رکا جائے۔ انہی کا نام حدود اللہ ہے۔ اسی کو قرآنی نظامِ حیات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آئے گا کہ کس مقام پر کونسی صفت (قوت) روبعمل آنی چاہئے۔ سو اس کے لئے قرآن کے ان مقامات پر غور کرنا ضروری ہے جن میں امم سابقہ اور انبیائے گذشتہ کے احوال و کوائف مذکور ہیں۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ کس موقعہ پر خدا کی کونسی صفت ظہور میں آئی ہے۔ اسی سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ کونسے مقام پر ہماری کس قسم کی قوت کو روبکار آنا چاہئے۔ جب کسی معاشرہ کا اندازہ اس کے مطابق ہو جائے تو اس وقت کہا جائیگا کہ اس معاشرہ کی تشکیل فطرت اللہ (خدا کے تخلیقی قانون) کے مطابق ہے۔ یہی وہ معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوگی اور انھیں ٹھیک ٹھیک مقام پر صحیح اندازہ کے مطابق صرف میں لایا جائے گا۔ جب انسانی معاشرہ ان خطوط پر متشکل ہوگا تو اس کا فطری نتیجہ (یعنی قانونِ تخلیق کے مطابق نتیجہ) یہ ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربھا۔ (زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی)۔ اور یہی وہ نور ہوگا جس کی روشنی میں انسانیت اپنے بلند مقامات کی طرف رواں دواں چل پڑے گی۔ ویسعیٰ نورھم بین ایدیھم وبایمانھم۔ لہٰذا سلیم! سب سے پہلے اللہ کے اسماء حسنیٰ کا قرآنی مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اسلئے کہ قرآنی تعلیم کی بنیاد یہی ہے۔ اسی لئے قرآن نے "اللہ پر ایمان" لانے پر اس قدر زور دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانا درحقیقت اپنے آپ کا صحیح صحیح اندازہ لگانا اور اپنی منزلِ مقصود کو پہچاننا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھو تو اسماء حسنیٰ درحقیقت انسان کی اپنی صفاتِ حسنہ (مضمر جوہروں کے متناسب امتزاج) کا بیان نظر آئیگا۔ اسی لئے حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ

محمدؐ بھی ترا۔ جبریلؑ بھی۔ قرآن بھی تیرا مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا

اگر کبھی فرصت مل گئی سلیم! تو تمہیں کم از کم اسماء حسنیٰ کا قرآنی مفہوم تو سمجھا چھوڑوں گا — شاید کہ خود را باز آفرینی!

امید ہے سلیم! ان تصریحات سے فطرت اللہ کے متعلق اور گوشے بھی نکھر کر تمہارے سامنے آگئے ہوں گے اور اب اس عنوان پر تمہیں کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہ رہی ہوگی۔ والسلام

پرویز

سازش

اور ——— بہت بڑی سازش

اسلام اپنے ساتھ ایک پیغامِ انقلاب لایا جس سے مفہوم یہ تھا کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام بن کر نہ رہے۔ نہ جسمانی حیثیت سے نہ ذہنی اعتبار سے۔ اس انقلاب کا فطری نتیجہ دنیا سے ملوکیت اور پیشوائیت کی ہر نوع کا مٹ جانا تھا۔

محمد رسول اللہ والذین معہ کی انقلابی جماعت اس پیغام کو لیکر اٹھی اور ان قوتوں کی بدولت جو قرآنی نظام نے پیدا کر دی تھیں وہ چاروں طرف پھیل گئی اور جہاں تک ان کے قدوم سعادت لزوم پہنچے، ملوکیت اور پیشوائیت کی ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔

ان خطوں میں جو اس انقلاب کی آماجگاہ بنے، سرزمینِ ایران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے کے ایران کا شمار دنیا کی ممتاز ترین مملکتوں میں ہوتا تھا اور ایک قدیمی تہذیب کا گہوارہ تصور کیا جاتا تھا۔ وہاں کے عوام کے لئے یہ انقلاب آیۂ رحمت تھا لیکن جن طبقات کے مفاد، ملوکیت اور پیشوائیت کے دامنوں سے وابستہ تھے، ان کیلئے یہ انقلاب پیغامِ موت تھا۔ وہ اس تبدیلی میں، جس میں ان کا ایک ادنیٰ غلام، ہمدوشِ کسریٰ ہو جاتا تھا، اپنی انتہائی ذلت محسوس کرتے تھے۔ اور پھر یہ ذلت بھی اُن عربوں کے ہاتھوں جنھیں وہ ابھی کل تک "اونٹ کا دودھ پینے والے اور سوسمار کھانے والے" کہکر انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

اس تذلیل و تحقیر کے تصور سے ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی ذلتوں کا بدلہ لیکر چھوڑیں گے۔ انھوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے حریف ہو نہیں سکتے۔ اسلئے انھوں نے اس انتقام کے لئے دوسرے میدان تلاش کرنے شروع کئے۔

انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ساری قوت کا راز اس نظام میں پوشیدہ ہے جو قرآن نے قائم کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس نظام کو درہم برہم کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو قرآن سے مجبور کر دیا جائے تاکہ یہ دوبارہ اس نظام کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ وہ مسلمانوں سے الگ تھلگ رہ کر اس منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ تسبیح بدست اور خرقہ پوش ان کے اندر آئے۔ کوئی مساجد و مکاتب میں، کوئی خانقاہوں اور ریاضت گاہوں میں۔

ان کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ مسلمانوں میں پہلے یہ عقیدہ عام کر دیا جائے کہ اسلام کا سرچشمہ قرآن ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بہت کچھ اور بھی ہے۔ اس سے ان کیلئے غیر اسلامی عناصر کو اسلام میں داخل کرنے کی راہیں کشادہ ہو جاتی تھیں۔ انھوں نے اس عقیدہ کو عام کیا اور

اس کے ساتھ ہی روایات وضع کرنی شروع کردیں۔ ادھر روایات کو پھیلایا اور اُدھر انہیں مدون شکل میں جمع کرنا شروع کیا تاکہ یہ کتابیں آسانی سے قرآن کی جگہ لے لیں [1]

جب روایات کے یہ مجموعے دین قرار پاگئے تو انہی کی رُو سے قرآن کی تفسیریں ہونی شروع ہوگئیں (ان سے پہلے قرآن کی کوئی مدون تفسیر مسلمانوں میں موجود نہ تھی) اور انہی سے مسلمانوں کی تاریخ مرتب ہونے لگی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہو یہ گیا کہ ہر غیر اسلامی عنصر کی سند "دین کے سرچشموں" سے ملنے لگی۔ جو کچھ تفاسیر میں لکھا تھا وہ خدا کا حکم قرار پاگیا۔ جو روایات میں تھا، وہ سنتِ رسول اللہ بن گیا۔ اور جو کچھ تاریخ نے پیش کیا وہ مسلکِ صحابہ کبارؓ و تابعینؒ وغیرہ کی شکل میں پیش ہوگیا۔ اس سے دین کے بنیادی تصورات کے ساتھ کیا کچھ ہوا اُسے تو چھوڑیئے۔ خود حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگیوں کے متعلق ان "مستند اور مقدس" صحیفوں میں وہ کچھ بھر دیا گیا جس سے ہر دور میں بیسیوں نابکار زندیق اور سینکڑوں دریدہ دہن دجال پیدا ہوتے رہے۔ چونکہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگوں نے ان کتابوں کو پڑھا نہیں ہوتا اور ان کی عقیدت صدیوں سے متوارث چلی آرہی ہے اس لئے جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا (بلکہ یوں کہئے کہ باور نہیں کیا جاسکتا) جب تک کوئی نمایاں مثال نہ پیش کردی جائے۔ ہم محض اس مقصد کی خاطر، دل پر ہزار جبر کرکے، ایک مثال پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، ان تمام مقدس روحوں سے ہزار ہزار معذرت کے ساتھ جو اس عجمی سازش کا نشانہ بنائی گئیں۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ —— ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست!

کسی معاشرہ کی صالحیت کے لئے، جنسی تعلقات (Sex-Relations) کا صحیح خطوط پر تشکل ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ قرآن نے اس ضمن میں ایسے واضح اور غیر مبہم حدود مقرر کردیئے جن سے جنسی نوضویت (sexual anarchy) کی جگہ، معاشرہ میں صحیح اور متوازن نظم و ضبط (Order) پیدا ہوگیا۔ اس نے جنسی تعلق کی ایک ہی صورت کو جائز قرار دیا جسے نکاح کہتے ہیں۔ اس کے سوا تمام دوسری شکلوں کو روک دیا۔ نکاح کے متعلق بھی ایسے واضح خطوط اور حدود متعین کردیئے جس سے نکاح اور عدم نکاح کی تمیز میں کوئی دشواری نہ رہے۔ قانونی طور پر نکاح ایک معاہدہ ہے جس کا انفساخ (Cancellation) صرف طلاق سے ہوسکتا ہے جس کی تمام تفاصیل قرآن میں موجود ہیں۔ معاشرتی طور پر یہ ایک اقرارنامہ ہے جس کی رو سے دو افرادِ انسانیہ ایک جوڑا (زوج) بنکر باہمی رفاقت اور توافق سے، زندگی کی گاڑی کھینچنے کا تہیہ کرتے ہیں اور ایک چھوٹے سے پیمانے پر ایک "محدود مملکت" کے اندر، قرآن کے نظامِ ربوبیت کو جاری و ساری کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہیں۔ یہ اہم فریضہ ادا ہو نہیں سکتا جب تک میاں بیوی کے تعلقات ایسے گہرے نہ ہوں کہ ان میں کوئی تیسری شخصیت حائل نہ ہو اور ایک دوسرے کا پورا پورا رازداں و ہمرنگ نہ ہو۔ قرآن نے اس کیفیت کو ھن لباس لکم

---

[1] یہ اس سازش کا صرف ایک شعبہ تھا لیکن سب سے بڑا راستہ یہی تھا جس سے غیر اسلامی عناصر کو دین بنایا گیا۔

وانتم لباس لھن (وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لئے) کے جامع الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ نفسیاتی طور پر اسے مودت اور رحمت کا نام لیکر پکارا ہے۔

ومن اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یتفکرون (۳۰/۲۱)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے رفیقِ حیات بنائے تاکہ تمہاری زندگی امن وسکون سے گزرے۔ اور اس کے لئے تم میں باہمی مودت اور رحمت پیدا کردی۔ ان سب باتوں میں ایک صاحب فکر وتدبر قوم کے لئے (زندگی کے پرسکون وکامران راستوں کی) علامات ہیں۔

یہی ہے نقشہ اس گھر کا جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ تمہارے لئے گوشۂ امن اور کاشانۂ سکون ہونا چاہیئے۔

وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (۷/۱۸۹)

(اسی نفس واحد سے) تمہارے رفیق زندگی بنائے تاکہ تمہیں سکون وطمانیت حاصل ہو۔

حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے (Biologically) نکاح سے مقصود افزائشِ نسل ہے جس کے لئے بیویوں کو حراث (کھیتی ۲/۲۲۳) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور معاشی نظام کے سلسلہ میں میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے ترکہ میں حصہ دار ٹھہرایا گیا ہے، اور ایسا حصہ دار کہ سب سے پہلے انہی کا حصہ تقسیم ہوتا ہے ورنہ حصصِ وراثت کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔[1]

یہ ہیں وہ حدود وقیود جن کے اندر جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ ان کے باہر محض جذباتِ شہوانیہ کی تسکین کا ذریعہ، فلہٰذا ناجائز۔ ان حدود وقیود کو مختصراً پھر سامنے لے آیئے۔

(۱) تراضیٔ مابین سے

(۲) ایک ایسا معاہدہ جو صرف طلاق علی سے فسخ ہو سکتا ہے۔ (یا موت سے)

(۳) جس کا مقصد افزائش نسل۔ عائلی زندگی میں "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت۔ باہمی محبت اور مودت۔ ایک دوسرے کی رفاقت باعثِ سکون وطمانیت۔ اور اس طرح ایک چھوٹی سی وحدت (Unit) میں قرآنی نظام کو مرتسم کرنا۔

(۴) جس میں اولاد کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لی جاتی ہیں۔

(۵) جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کے ترکہ میں حصہ پاتے ہیں۔

---

[1] یہ ایک فنی سا مسئلہ ہے جس کے حل کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ اس اہم نکتہ کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مروجہ قانونِ وراثت میں مختلف حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) نہیں آتی اور اس کیلئے انہیں "عول" کا مسئلہ وضع کرنا پڑا ہے۔

اس کے برعکس جنسی تعلق کی ایک دوسری شکل ہے جس میں ایک آدمی اور ایک عورت، باہمی رضامندی سے کسی قسم کے معاوضہ کے ساتھ ایک وقت یا ایک سے زیادہ اوقات کے لئے مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ اسے زنا کہا جاتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں قسم کے تعلقات کو دو لفظوں میں بیان کیا ہے اور اس حسن و خوبی اور جامعیت کے ساتھ کہ انسانی ذوق اور بصیرت اس ایجاز و اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات

محصنین غیر مسافحین (۴/۲۴)

ہونے چاہئیں۔ یعنی محصنین نہ کہ مسافحین۔

حِصن کے معنی ہیں مستحکم چار دیواری سے گھری ہوئی محفوظ جگہ (قلعہ)۔ لہٰذا محصنین کے معنی ہوئے قانونِ خداوندی کی مقرر کی ہوئی حدود و قیود سے گھرے ہوئے تعلقاتِ زناشوئی۔

سفح کے معنی ہیں "بہانا"۔ پانی بہانا (دم مسفوح۔ بہتا ہوا لہو)۔ لہٰذا مسافحین کے معنی ہیں وہ جنسی تعلق جس سے مقصود محض مادۂ شہوت کا بہانا ہو۔

احصان اور مسافحت کے اس بین فرق کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن نے کس خوبصورتی سے نکاح (مع اس کی تمام ذمہ داریوں کے) اور زنا میں واضح خط کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ "محصنین غیر مسافحین"۔ حدود و قیود میں گھرے ہوئے نہ کہ محض شہوانی مادہ کے بہانے کے لئے۔ حقیقت یہ ہے کہ نکاح اور زنا میں فرق ہی اتنا ہے ورنہ جہاں تک عملِ طبعی (Physical Action) کا تعلق ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

نبی اکرمؐ ساری دنیا کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ صحابہؓ کی جماعت، دستِ نبویؐ کی تربیت یافتہ تھی۔ لہٰذا اُس معاشرہ میں جنسی تعلقات کی ایک ہی صورت ممکن تھی، یعنی احصان کی شکل۔ وہاں مسافحت کی شکل تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ اس معاشرہ کے افراد وہ تھے جنہیں خود اللہ تعالیٰ ھم لفروجھم حافظون (۲۳/۵) کا سارٹیفکیٹ عطا کرتا ہے[1]۔ لیکن اب دیکھئے کہ ہماری کتب احادیث و تفسیر ان حضرات (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق اس باب میں کیا بیان کرتی ہیں۔

شیعہ حضرات ایک مسئلہ کے قائل ہیں جسے متعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی مرد اور عورت کا "وقتی طور پر مباشرت کے لئے نکاح کر لینا اور عورت کو اس جنسی تعلق کا معاوضہ دیدینا۔ اس وقت معینہ کے گذر جانے کے بعد (خواہ وہ ایک ہی مباشرت کیلئے ہو) یہ "نکاح" خود بخود فسخ ہو جاتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ہاں متعہ جائز نہیں ہے۔

---

[1] اسی طرح مومن عورتوں کو بھی (والحافظات ۳۳/۳۵)

سنی اور شیعہ (یا مسلمانوں کے دوسرے فرقوں) کے متعلق طلوعِ اسلام کا مسلک بالکل واضح ہے۔ وہ فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے اور اس کی بنیاد شخصیت پرستی قرار دیتا ہے۔ جب رسول اللہؐ نے خالص قرآن کی بنیادوں پر دین کا نظام قائم فرمایا تھا تو امت میں کسی فرقے کا وجود نہ تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرقہ کسی نہ کسی شخصیت تک جا کر رک جاتا ہے۔ قوانینِ خداوندی (یعنی قرآن) تک نہیں پہنچتا[1]۔ لہٰذا طلوع اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اس باب میں سنی کیا کہتے ہیں اور شیعہ کیا! جس مقصد کے لئے ہم نے متعہ کا ذکر کیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ سنی حضرات متعہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس میں اور زنا میں صرف لفظی فرق ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ لہٰذا سنی اس امر کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ متعہ کا حکم دے سکتے تھے یا صحابہ کبارؓ متعہ کیا کرتے تھے۔

لیکن دیکھئے کہ خود سنیوں کے ہاں کے مستند احادیث کے مجموعے اور تفسیر کی کتابیں اس باب میں کیا کہتی ہیں! شیعہ حضرات کے مجتہد سید علی نقی صاحب کا تصنیف فرمودہ ایک رسالہ ہے "متعہ اور اسلام"۔ اس میں انھوں نے شروع سے آخیر تک، سنیوں کی احادیث اور تفاسیر سے ثابت کیا ہے کہ متعہ کی اجازت خود رسول اللہؐ نے دی۔ صحابہؓ کا اس پر عمل رہا۔ اور تابعین اور فقہائے مکہ اس کو بدستور جائز قرار دیتے رہے۔

پہلے وہ روایات دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے خود متعہ کی اجازت دی تھی! کسے اجازت دی تھی؟ خود صحابہؓ کو!

سنیوں کی سب سے معتبر کتاب، بخاری شریف ہے جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں (جلد دوم ص۷۵۹ مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی۔ و جلد سوم ص۱۴۶ مطبوعہ مصر) حسب ذیل حدیث آئی ہے۔

> عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان (اپنے مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا) نہ ہوتا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع نہ کرا دیں؟ حضورؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا پھر ہمیں اجازت دی کہ ہم عورتوں سے کسی کپڑے (وغیرہ) کے عوض میں "نکاح" کر لیا کریں۔

بخاری کے بعد صحیح مسلم کا مرتبہ ہے۔ اس میں یہ روایت تین طریقوں سے آئی ہے۔ اس میں ایک جگہ "الیٰ اجل" کا اضافہ ہے "یعنی رسول اللہؐ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم ایک میعاد مقررہ کے لئے عورتوں سے کپڑے وغیرہ کے عوض نکاح کر لیا کریں"۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس میں لڑائیوں کے زمانے کی تخصیص نہ تھی۔ (صحیح مسلم مطبوعہ مجتبائی دہلی۔ جلد ۱ ص۴۵۰)۔

---

[1] جنہیں "اہل قرآن" کہا جاتا ہے وہ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ قرآن پر عمل انفرادی طور پر کیا جا سکتا ہے اس لئے وہ بھی قرآن کی تشریح و تفسیر کیلئے کسی نہ کسی فرد کی طرف ہی رجوع کر سکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن ایک اجتماعی نظام قائم کرتا ہے جس میں قرآنی احکام کا نفاذ مرکزِ ملت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایسے نظام میں اطاعت، قانون کی ہوتی ہے، اشخاص کی نہیں۔

جمع الفوائد (شیخ محمد بن محمد سلیمان سوسی مالکی ـ مطبوعہ میرٹھ ـ جلد ۱ ص ۲۲۲) میں اس روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ لڑائیوں پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے مذکورہ بالا اجازت دی تھی۔ (یعنی ایک وقتِ معین کے لئے نکاح کی اجازت)۔

یہی روایت مسند امام ابی عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی مطبوعہ مصر ص ۱۲۵ میں بھی ہے۔ نیز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے منتقی الاخبار میں اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے اور صاحب کنز العمال (ج ۸ ص ۲۹۵) نے لکھا ہے کہ امام طبری نے تہذیب الآثار میں اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث۔ صحیح بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۲ ص ۷۶۶ و مصر جلد ۳ ص ۱۵۱) میں یوں درج ہے:۔

جابر بن عبد اللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ حضورؐ کا فرستادہ شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ تم متعہ کرو۔ پس اب تم متعہ کر سکتے ہو۔

صحیح مسلم (ص ۴۵۱) میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ کے منادی کرنے والے نے آکر اعلان کیا کہ تم لوگوں کو متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری روایت (مسلم ص ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے خود تشریف لاکر متعہ کی اجازت کا اعلان فرمایا۔

تیسری حدیث۔ بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۱ ص ۷۶۶ و مصر ص ۱۵۱) میں یوں ہے:۔

سلمہ بن اکوع کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد و عورت آپس میں قرارداد کرلیں تو تین راتوں تک ان کی معاشرت کی میعاد ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو اس مدت میں اضافہ کرلیں اور اگر چاہیں تو جدائی اختیار کرلیں۔

صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی ص ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے جنگ اوطاس والے سال تین دن کے میعادی متعہ کی اجازت دی۔ یہی روایت جمع الفوائد۔ سنن دارقطنی اور کنز العمال میں بھی ہے۔

اب ذرا اس کی تفصیل سنئے۔ صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی ص ۴۵۱) میں ہے:۔

سبرۂ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص، بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دونگا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ اپنی چادر دیگا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی لیکن میں اس کی بہ نسبت جوان تھا۔ وہ عورت جب چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔

غور فرمایا آپ نے کہ جناب امام مسلم نیشاپوری، صحابہ کبارؓ کا کیا نقشہ کھینچ رہے ہیں! (استغفر اللہ۔ استغفر اللہ)

کنز العمال (جلد ۸ ص ۲۹۴) میں سبرہ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حجۃ الوداع میں

جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی پھر حضورؐ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے آکر عرض کیا کہ عورتیں متعہ کے لئے راضی نہیں ہوتیں جب تک کوئی میعاد نہ مقرر کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میعاد مقرر کرکے متعہ کرلو۔

آپ نے دیکھا کہ ہمارے راویوں کے بیان کے مطابق، نبی اکرمؐ اپنے آخری حج میں صحابہؓ کو کیا تعلیم دے رہے ہیں! (اللھم اغفرلنا۔ اللھم اغفرلنا)

اہل سنت والجماعت حضرات کی مدافعت (Defence) یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ نے بیشک متعہ کی اجازت دی تھی لیکن بعد میں اس کی ممانعت فرمادی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جی میں خوش ہولیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ماتھے سے ایک بہت بڑے کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا لیکن یہ سادہ لوح اتنا نہیں سمجھتے کہ جو رسولؐ (ان راویوں کے بیان کے مطابق) اپنی نبوت کے آخری سالوں تک متعہ جیسے فعل کی اجازت دیتے رہے، اس رسولؐ کے متعلق (معاذاللہ معاذاللہ) دنیا کیا رائے قائم کرے گی؟

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ متعہ کی ممانعت کی جسقدر روایات ہیں ان میں ایسا تضاد رکھ دیا گیا ہے کہ سوچنے والا اُلٹے مخمصے میں پھنس جائے کہ یہ کیا پریشان کن روایات ہیں۔ مثلاً کنز العمال (جلد ۸ صفحہ ۲۹۵) میں ایک ہی راوی (سبرہ جہنی) سے (جنکی روایت اوپر گذر چکی ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت حجۃ الوداع میں دی تھی) تین مختلف روایات ہیں۔ جن میں سے

ایک میں ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن سعہ سے ممانعت فرمائی۔

دوسری میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے دن ممانعت فرمائی۔ اور

تیسری میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں ممانعت فرمائی۔

لیکن شرح مسلم نووی (مطبوعہ دہلی جلد ۱ صفحہ ۴۵۰) میں اسحٰق بن راشد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے جنگ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔

اندازہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح کثرت تعبیر سے خواب کو پریشان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ یوں سمجھنا چاہئے کہ متعہ ایک سے زیادہ مرتبہ جائز قرار دیا گیا اور ایک سے زائد مرتبہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ امام مسلمؒ نے اس باب کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے۔

باب نکاح المتعۃ وبیان انہ ابیح ثم نسخ۔ ثم ابیح ثم نسخ۔ واستقر تحریمہ الی یوم القیامۃ۔

باب نکاح متعہ اس امر کے بیان میں کہ وہ مباح تھا پھر منسوخ ہوا۔ پھر مباح ہوا اور اس کے بعد پھر منسوخ ہوا اور پھر قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم رہی۔

چلئے! ایک بات تو طے ہوئی کہ حضورؐ نے جب آخری بار متعہ کی ممانعت فرمادی تو پھر وہ قیامت تک کیلئے حرام ہوگیا۔

لیکن ٹھہریئے! اسی صحیح مسلم کے (جس نے اوپر لکھا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعہ قیامت تک کیلئے حرام ہوگیا) کچھ اوراق آگے الٹئے اور دیکھئے ان میں کیا نظر آتا ہے۔ جلد ۱ صفحہ ۴۵۱ پر درج ہے:۔

> عطا کی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہؓ عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ آئے تو ہم ان کی ملاقات کو گئے اور مختلف لوگوں نے ان سے مختلف سوالات دریافت کئے۔ پھر متعہ کا ذکر آیا۔ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! ہم لوگوں نے عہدِ رسول اللہؐ اور عہدِ ابوبکرؓ اور عہدِ عمرؓ میں برابر متعہ کیا ہے۔

لیجئے! رسول اللہؐ اسے قیامت تک کے لئے حرام قرار دے چکے ہیں لیکن صحابہ کبارؓ حضرت عمرؓ کے زمانے تک برابر متعہ کئے جا رہے ہیں (معاذ اللہ) اسی صحیح مسلم میں دوسری روایت یوں ہے:۔

> ابوالزبیر کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم لوگ برابر ایک مٹھی بھر جو یا آٹے کے عوض میں متعہ کرتے رہے ہیں جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں اور پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن حریث والے واقعے میں اس کی ممانعت کی۔

کنز العمال میں اس کی اجرت "ایک پیالہ بھر ستو" لکھی ہے۔ اس کی تائید فتح الباری (شرح صحیح بخاری) جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ نے بھی کی ہے۔

کنز العمال (ص ۲۹۴) میں اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے:۔

> ام عبداللہ بنت ابی خیثمہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی شام سے آیا اور ان کے مکان میں قیام کیا۔ اس نے کہا کہ بغیر عورت کے مجھے بڑی تکلیف ہے تم میرے لئے کوئی عورت تلاش کرو جس سے میں متمتع ہو سکوں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے اسے ایک عورت کا پتہ دیا اور اس نے اس سے متعہ کیا اور اس پر کچھ عدول لوگوں کی گواہیاں قرار دیں۔ پھر ایک طویل زمانے تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے بعد شام واپس چلا گیا۔ کسی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انھوں نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ انھوں نے فرمایا کہ جب وہ پھر آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ جب وہ آیا تو میں نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ انھوں نے اسے بلوا بھیجا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ایسا رسول اللہؐ کے سامنے کیا۔ انھوں نے منع نہیں کیا یہاں تک کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایسا ہوا۔ انھوں نے بھی منع نہیں کیا۔ پھر خود آپ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ آپ نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر میں پہلے ممانعت کر چکا ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیتا۔ اچھا اب جدائی اختیار کر لو تاکہ نکاح اور سافحت (زنا) میں تمیز ہو سکے۔

ابھی تک تو صرف صحابہؓ (مردوں) ہی کا ذکر تھا۔ مندرجہ بالا روایت میں ایک صحابیہؓ کا بھی ذکر آ گیا کہ انھوں نے اس "کارِ خیر" میں کس قدر مدد کی! (یا اللہ! توبہ) لیکن اسی پر اکتفا تھوڑا ہے؟ ان "بزرگوں" کو ایران کی جنگ کے میدانوں میں جو چرکے لگے تھے ان کی آتشِ انتقام اس سے تھوڑی فرو ہو سکتی تھی! وہ جب تک اسلامی معاشرہ کے مردوں کے ساتھ ان کی عصمت مآب خواتینِ محترمہ کو بھی (معاذ اللہ۔

معاذ اللہ، سرِبازار رسوا نہ کر لیتے انھیں کب چین پڑ سکتی تھی۔ دیکھئے کہ ان کے انتقام کا ہاتھ کہاں تک پہنچ رہا ہے! لیکن اسے دیکھنے سے پہلے حیا سے کہئے کہ وہ آنکھیں بند کرلے۔ غیرت سے کہئے کہ وہ کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ شرم سے کہئے کہ وہ اپنا منہ چھپا لے۔ کہ اب ذکر آ رہا ہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی، حضرت عائشۃ الصدیقہؓ کی بہن، حضرت زبیرؓ کی رفیقۂ حیات، حضرت اسماء، ذات النطاقین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا۔ یہ ذکر ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (ص۵۸) پر۔ وہاں لکھا ہے (توبہ۔ توبہ۔ نقل کفر کفر نباشد)

روی النسائی والطحاوی عن اسماء بنت ابی بکر قالت فعلنا ھا علی عھد رسول اللہ ﷺ

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہمارے ساتھ متعہ ہوا۔

اسی بنا پر جب حضرت اسماء کے بیٹے (عروہ) نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ تم کو خدا کا خوف نہیں کہ تم متعہ کی اجازت دیتے ہو، تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ اسئل امک یا عروہ "ذرا جا کر اپنی والدہ سے پوچھو"۔ (زاد المعاد ابن قیم۔ جلد ا ص۲۱۹)

(یلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً)

بہرحال۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی ممانعت کی تھی یا نہیں کی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے اسے ضرور بند کر دیا۔ چنانچہ زاد المعاد (ابن قیم) جلد ا ص۲۴۳ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "دو متعہ تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں رائج تھے لیکن میں انھیں بند کرتا ہوں۔ ایک متعۂ حج اور دوسرا عورتوں کے ساتھ متعہ"۔ آپ کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ چلئے! حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں سہی۔ یہ لغویت تو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سازش ہی کیا جو اس طرح ختم ہو جائے! ابھی سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ فتح الباری (شرح صحیح بخاری) جلد ۹ ص۱۳۸ پر ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ابن عباس کے تمام اصحاب جو اہلِ مکہ اور یمن سے تھے، جوازِ متعہ کے قائل تھے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطا اور تمام فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے تھے۔

یہ ہیں وہ احادیث مقدسہ اور ہمارے ائمہ کے اقوال اُس متعہ کے متعلق، جسے (اس روایت کی رو سے جو پہلے درج کی جا چکی ہے) خود حضرت عمرؓ نے مسافحت (زنا) قرار دیا تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سنی حضرات مناظروں اور مباحثوں میں ان اعتراضات کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ یہ تمام روایات اور ان کی شرحیں، سُنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہیں۔ اور کتابیں وہ ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ کی غیر متلو وحی کہا جاتا ہے جنھیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہ معہ) ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے "علمائے کرام" کو سندِ فضیلت ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجدوں میں باعثِ سعادت کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنھیں مسلمان اس لئے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنت رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبارؓ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے!

لیکن ٹھہریئے۔ ابھی تک صرف روایات ہی ذریعۂ انتقام گیری تھا۔ قرآن سامنے نہیں آیا تھا۔ اب دیکھئے کہ اس سازش نے کس طرح قرآن کو بھی ساتھ ہی لپیٹنے کی کوشش کی۔ قرآن کے معاملے میں دشواری یہ تھی کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا تھا۔ نبی اکرمؐ نے سینکڑوں حفاظ کو پورے کا پورا قرآن حفظ کرایا۔ انھیں خود قرآن سنایا۔ ان کا حفظ کردہ، نا حفظ کردہ میں خصوصیت یہ تھی کہ ترتیب کے علاوہ، اعراب اور تلفظ تک کی بھی جانچ پرتال ہو جاتی تھی۔ حفظ کے ساتھ ہی، قرآن کو باقاعدہ لکھوایا۔ اور اس طرح اسے مکمل کتاب کی صورت میں، اور حافظوں کے سینے میں، محفوظ کر کے امت کو دیا۔ اور حجۃ الوداع میں ایک لاکھ صحابہ سے اس کی شہادت لے لی کہ قرآن ان تک پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ان سازش کرنے والوں کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک و اضافہ کر سکتے۔ اسی مشکل کے پیش نظر تو انھیں روایات کو دین بنانے کی ضرورت پڑی!

یہ لوگ قرآن میں ردوبدل تو نہیں کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس امر کی پوری پوری کوشش کی کہ کم از کم دلوں میں شبہ تو پیدا کر دیا جائے کہ قرآن بھی محفوظ شکل میں نہیں رہا۔ چنانچہ اس قسم کی روایات اہل سنت والجماعت کے مستند مجموعہ ہائے احادیث میں موجود ہیں کہ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت، قرآن کسی مدون شکل میں موجود نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس نے مختلف شہادات کی بنا پر قرآن کو کتابی شکل میں مدون کیا۔ کچھ یہاں سے لیکر، کچھ وہاں سے لیکر۔ بعض آیات کے متعلق تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ ایک دن حضرت عائشہؓ کی بکری اندر چلی گئی اور ان پتوں کو کھا گئی۔ کہیں حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن قرار دیا گیا اور قرآن کا نام مصحفِ عثمانی رکھ دیا۔ یہ اور اسی قسم کی اور کہانیاں، وضع کر کے احادیث کے مقدس صحیفوں میں بھر دی گئیں۔ لیکن اس سے بھی یہ گنجائش نہیں نکلتی تھی کہ قرآن میں کہیں ردوبدل کیا جا سکے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک اور تدبیر اختیار کی گئی۔ ایک حدیث وضع کی گئی کہ نزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف (قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے)۔ سات حرف، یعنی چہ؟ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ قرآن سات قراتوں کے مطابق نازل ہوا ہے۔ بات پھر بھی صاف نہ ہوئی۔ اگر قرأت سے مراد قرآن پڑھنے کا انداز تھا تو سات قراتوں کے نزول سے کیا مطلب ہوا؟ لیکن یہ سازش اتنی سطحی نہیں تھی کہ اس کی لِم یونہی سامنے آجاتی۔ اس روایت کو جان بوجھ کر ایسا مبہم رکھا گیا تھا تاکہ اسے مختلف معانی پہنانے کی گنجائش رہے۔ اس کے ابہام کا یہ عالم ہے کہ امام سیوطیؒ نے اتقان میں لکھا ہے کہ اختلف فی معنی سبعۃ احرف علیٰ اربعین قولاً۔ ان سات حرفوں کے معنی سمجھنے میں چالیس اقوال وارد ہوئے ہیں۔ ان "سات حرفوں" کو یہاں تک کھینچ کر لے گئے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ "یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ بیشک رحمت اور عذاب کی آیتوں میں ادل بدل نہ کرو"۔ یہ لوگ اس طرح زمین ہموار کرنے کے بعد آگے بڑھے۔ آپ نے تفسیر کی کتابوں میں دیکھا ہوگا متعدد آیات کے بعد لکھا ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت کی رو سے یہ آیت یوں آئی ہے اور حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے۔ یہ فرق

قرأت کا نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کا ہوتا ہے۔ قرآن میں ردوبدل کرنے کی یہ تدبیر بڑی لطیف اور غیر محسوس تھی اس لئے یہ فریب چل گیا۔

دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدیم

اس تمہید کے بعد دیکھئے کہ مسئلہ زیر نظر (یعنی متعہ) کے سلسلہ میں قرآن سے کس طرح سند لی گئی۔ سورۂ نساء میں نکاح کے تفصیلی احکام مذکور ہیں۔ وہاں ان عورتوں کا ذکر کرنے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے، فرمایا کہ ان کے علاوہ اور سب عورتوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ تم ان کا مہر مقرر کردو اور انہیں نکاح میں لاؤ "محصنین غیر مسافحین"۔ ان تمام حدود و قیود کے ساتھ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے نہ کہ محض شہوت رانی کے لئے۔ اس کے بعد ہے فما استمتعتم بہ منہن فاتوھن اجورھن فریضۃ۔ ان میں سے جن عورتوں کو تم نکاح میں لاکر ان سے متمتع ہو تو ان کا مہر ادا کرنا ضروری ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نکاح دائمی معاہدہ ہوتا ہے جس کا فسخ طلاق یا موت کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس متعہ ایک مقررہ مدت کیلئے جنسی تعلقات کا نام ہے۔ قرآن سے متعہ کی دلیل اسی صورت میں مل سکتی تھی کہ اس میں کہیں یہ لکھا مل جاتا؟ کہ یہ جنسی تعلقات ایک مقررہ مدت (اجل مسمیٰ) کے لئے بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں ایسا کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ اب دیکھئے کہ اس کیلئے "اختلافِ قرأت" کی تدبیر سے کس طرح فائدہ اٹھایا گیا۔

امام طبری کی تفسیر اہل سنت والجماعت کے ہاں ام التفاسیر کہلاتی ہے۔ یہ سب سے پہلی مدون تفسیر ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں قریب قریب اسی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ دیکھئے کہ حضرت امام طبری متعہ کی سند کس طرح لاتے ہیں۔ آیۂ مذکورہ صدر کی تفسیر میں ارشاد ہے۔

> ابو ثابت کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ نے مجھے ایک مصحف دیا اور کہا کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت کے مطابق ہے یحییٰ بن عیسیٰ جو اس روایت کے ناقل ہیں، نصیر بن ابی الاشعث سے ان کا بیان ہے کہ میں نے اس مصحف کو نصیر کے پاس دیکھا اس میں یہ لکھا تھا کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمیٰ (یعنی تم ان عورتوں سے متعہ کرو ایک میعاد مقررہ کیلئے)
>
> نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا انھوں نے کہا کہ کیا تم سورۂ نساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا کیوں نہیں؟ کہا پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمیٰ۔ میں نے کہا نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انھوں نے کہا اچھا، تو معلوم ہونا چاہیے کہ اصل آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابو نضرہ سے اسی طرح کا واقعہ منقول ہے۔ تیسری روایت میں بھی ابو نضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم بہ منھن۔ ابن عباسؓ نے کہا الیٰ اجل مسمیٰ۔ میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انھوں نے تین مرتبہ کہا خدا کی قسم خدا نے اسے اسی طرح نازل کیا ہے۔

ابو اسحٰق کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے پڑھا فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمی۔ پانچویں روایت شعبی کی ہے اس میں بھی ابو اسحٰق سے ایسی ہی روایت ہے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ ابی بن کعبؓ کی قرأت میں یوں ہے فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمیٰ۔ عمر بن مرہ کی روایت ہے کہ میں نے سعید بن جبیر کو پڑھتے سنا فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجل مسمیٰ۔

یہ اقتباس کسی شیعہ بزرگ کی کتاب کا نہیں بلکہ سنیوں کے جلیل القدر امام طبری کی تفسیر کا ہے۔ اور جن حضرات کی طرف یہ روایات منسوب ہیں وہ بلند پایہ صحابی ہیں جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آیت اُس طرح نہیں نازل ہوئی تھی جس طرح قرآن میں درج ہے بلکہ اس اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی جس سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ غور کیا آپ نے کہ "سات حرفوں" والی روایت نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی؟ یعنی پہلے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ قرآن سات قراتوں کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اور اس کے بعد جس آیت کے متعلق جی چاہا کہہ دیا کہ فلاں صحابی کی قرأت میں یوں آیا ہے اور فلاں کی قرارت میں یوں۔ اور اس طرح جو جی چاہا قرآن سے ثابت کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کا یہ اعجاز اپنی جگہ ہے کہ اس کے متن میں کسی قسم کی تبدیلی یا اضافہ کی جرأت نہیں کی جا سکی۔ اس کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر محکم ہے۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔ باطل کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

ہم نے اس عجمی سازش کی طرف ایک مثال پیش کی ہے۔ اس سے دیکھئے کہ سنیوں کی نہایت معتبر کتب روایات اور مستند تفاسیر میں خدا، رسول، صحابہ، تابعین وغیرہ کی کس قسم کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان روایات اور تفاسیر کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ:-

(i) جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہؓ کی قراتوں کی رو سے ان کی ترتیبی شکلیں کچھ اور تھیں۔

(ii) خود رسول اللہؐ نے صحابہؓ کو مٹھی بھر جو یا آٹے کے عوض میں، عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور یہ اجازت نبوت کے آخری دور تک جاری رہی۔

(iii) عہد رسالتمآبؐ اور عہد صحابہؓ کے اسلامی معاشرہ میں متعہ عام تھا اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ مردوں کو نہ عورتوں کو۔

(iv) رسول اللہؐ نے اپنے آخری زمانہ میں متعہ کو حرام قرار دیدیا تھا لیکن اس کے باوجود عہد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک متعہ برابر جاری رہا۔

(v) حضرت عمرؓ نے متعہ کو بند کر دیا لیکن اس کے باوجود صحابہ، تابعین اور فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے۔

(۷) اور جنھوں نے اسے طوعاً کرہاً جائز سمجھا وہ بھی یہ کہتے رہے کہ عمرؓ نے خدا کی ایک بہت بڑی رحمت کو روک دیا۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری (ص۶۰) میں لکھتے ہیں کہ:-

محدث عبد الرزاق نے اپنی کتاب میں ابن جریج سے اور انھوں نے عطاء سے روایت کی ہے کہ ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ متعہ کا جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمرؓ نے اس کی ممانعت نہ کردی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ عجمی سازش کے عناصر کن کن راہوں سے اسلامی معاشرہ میں آ کر گھسے تھے اور کیسے کیسے مقدس نقابوں میں غارتگر دین و دانش ہوئے تھے۔ اس بات کی البتہ داد دینی پڑتی ہے کہ یہ سازش اس قدر سادگی و پرکاری سے بروئے کار لائی گئی کہ ہزار برس سے یہ اسی کامیابی کے ساتھ بدستور چلی جا رہی ہے اور اس وقت تک اس کی سحر کاریوں اور ابلہ فریبیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ جانے اس میں کیا جادو بھر کر رکھ دیا گیا ہے کہ ان تمام لغویات و خرافات کو ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ آغا حشر نے جس محبوب کے متعلق کہا تھا کہ

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

عجمی سازش کے یہ نظر فریب عناصر کسی صورت میں بھی اس سے کم سحر کار نہیں۔ اس سازش کی زندگی اور قوت کا راز "مولویت" میں پوشیدہ ہے اور "مولویت" درحقیقت ایک معاشی مسئلہ ہے۔ یہی وہ کتابیں ہیں جنھیں پڑھ کر ایک شخص مستند مولوی بنتا ہے۔ اور یہی "علم" اس کے معاش کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا اُسے کوئی ہنر نہیں آتا جس سے وہ اپنی روٹی کما سکے۔ اس لئے وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کتابوں میں کس قدر لغویت بھری ہے، انھیں الگ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان کے الگ کرنے سے اس کے رزق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ آپ نے کسی مداری کو نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے تھیلے کو یہ کہہ کر پھینک دے کہ یہ سب فریب کا جال اور دھوکے کا پٹارہ ہے۔ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے سر پہ اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے کیونکہ اس سے اس کا رزق وابستہ ہے۔ "مولویت" کے ساتھ تو رزق کے علاوہ تعظیم و تکریم بھی ہوتی ہے۔ لوگ پیسے بھی دیتے ہیں اور ہاتھ بھی چومتے ہیں۔ بھلا کہئے کہ کون بیوقوف ایسے ذریعۂ معاش پر لات مارےگا درآنحالیکہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اس کے بعد وہ ایک وقت کی روٹی کما سکنے کی بھی استعداد نہیں رکھتا۔ یہ مسندیں، یہ منبر یہ مکتب، یہ دار العلوم، یہ علماء کی جمعیتیں، یہ اسلامی جماعتیں۔ غرضیکہ عجمی سازش کی یہ تمام پرورش گاہیں اسب معاش کے دھندے ہیں۔ اس ہزار سالہ سازش کے ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بیکاروں کے اس موجودہ طبقہ (یعنی مولوی صاحبان) کے معاش کا بندوبست کر دیا جائے۔ آئندہ کیلئے اس تعلیم کو یکسر بند کر دیا جائے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ خالص قرآن کی تعلیم دی جائے اور تاریخ کو صرف تاریخ کی حیثیت دی جائے نہ کہ دین کی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے معاشرہ کو قرآن کے

خطوط پر از سر نو تشکل کیا جائے۔ قرآنی نظام ہی نے ملوکیت اور پیشوائیت کا پہلے خاتمہ کیا تھا۔ اور قرآنی نظام ہی اب بھی جسدِ انسانیت کے اس جذام کا علاج کر سکتا ہے۔ اس کے سوا اس کے علاج کی کوئی صورت نہیں۔ اس طریق علاج سے فائدہ یہ ہوگا کہ عجمی سازش کے یہ مسموم اثرات ختم ہو جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی صحیح قرآنی معاشرہ کا قیام عمل میں آجائے گا جو انسانیت کو ہر نوع کی غلامی سے نجات دینے کا ضامن ہے۔ لیکن اگر یہ طریق علاج اختیار نہ کیا گیا تو پھر زمانے کا سیلاب ان فرسودہ اور دور از کار لغویات کو خود بخود بہا کر لے جائے گا۔ اس سے ہوگا یہ کہ اس غلط مذہب پرستی کی جگہ صحیح دینی نظام کا وجود عمل میں نہیں آسکے گا بلکہ کھلا ہوا الحاد اور لادینی انسانی معاشرہ پر چھا جائے گی۔ اس لئے کہ سیلاب جہاں خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے، وہاں کھیتوں کو بھی تباہ و برباد کرتا ہے۔ اب یہ چیز ارباب فکر و نظر کے سوچنے کی ہے (اگر ان کا وجود ہمارے معاشرہ میں کہیں ہے تو) کہ وہ اول الذکر صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں یا حالات کو اپنے رخ پر جانے دینا چاہتے ہیں کہ زود یا بدیر وہ سیلاب بے پناہ آئے اور مُردوں کی قبروں کے ساتھ زندہ انسانوں کی بستیاں بھی بہا کر لے جائے۔ یہی وہ سیلاب ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (۸/۲۵) "اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچائے رکھو جو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتا ہے جو بالخصوص ظلم پر کاربند ہوں" بلکہ اس کا دائرہ اثر و نفوذ بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ خس و خاشاک کے ساتھ، لالہ زاروں کو بھی برباد کر دیا کرتا ہے۔

اگر خدانکردہ ایسا ہی ہو گیا اور وہ سیلاب آپہنچا تو وہ دن عجمی سازش کے عفاریت کے لئے انتہائی مسرت کا دن ہوگا۔ وہ اس دن غول بیابانی کی طرح ناچیں گے کہ اس سے ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔ اس دن وہ کہیں گے کہ یہ اس انقلابِ عظیم کا انتقام ہے جس نے ان کی کلاہِ خسروی کو خاک میں ملا دیا تھا اور ان کی قبائے پیشوائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھدی تھیں۔ اس دن ہر قلبِ حساس وقفِ اضطراب اور ہر چشمِ اعتبار مصروفِ خونفشانی ہوگی لیکن اُس دن اس اضطراب و خونناب فشانی سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے اگر کچھ کرنا ہے تو اس کا وقت آج ہے۔ فھل من مدکر! کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟؟

اس دلخراش داستان کو ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر دیکھ لیجئے کہ صرف ایک (Sex - جنسی تعلقات) کے معاملے میں اس عجمی سازش نے اسلام کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔ اس باب میں ہماری "معتبر کتب احادیث" کی رو سے

(۱) چار بیویوں تک کے لئے اذن عام ہے[1]

---

[1] اس باب میں قرآن کا کیا حکم ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔

(۲) لونڈیوں کی کوئی تعداد ہی مقرر نہیں۔ جتنی جی چاہے گھر میں ڈال لیجئے۔

(۳) لونڈیوں سے مباشرت کی صورت میں عزل کر لینے کی اجازت ہے تاکہ انھیں حمل نہ قرار پا جائے اور اس طرح ان کی قیمت کم ہو جائے۔ (صحیح بخاری کی حدیث)

(۴) ان کے علاوہ جو عورت رضامند ہو جائے اس سے اجرت طے کر کے وقتی مباشرت کی اجازت۔ کم از کم عہد رسالتمآبؐ سے لیکر اولیں عہد حضرت عمرؓ تک ضرور تھی اور اس کے بعد بھی فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے تھے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ جس قوم میں (Sex) کے متعلق یہ کچھ پایا جائے۔ وہ قوم دنیا میں، شریف انسانوں میں منہ دکھانے کے قابل بھی رہ سکتی ہے؟ یہ حالت ہماری کر چھوڑی ہے بخارا اور نیشاپور اور طبرستان کے ان "ائمہ کرام" نے۔ اور ہم ہیں کہ ان کے ان کارناموں کو وحی خفی اور "قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل" قرار دے رہے ہیں۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد!

حسنِ نظر

"ڈائرکٹر ادب ایجوکیشن، بلوچستان نے، اپنی چٹھی نمبری 2816/Edn مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کی رو سے معارف القرآن (ہر چہار جلد) مصنفہ محترم پرویز صاحب کو صوبے کے کالجوں اور مدرسوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کیا ہے۔

ہم محترم ڈائرکٹر صاحب کو ان کے حسن انتخاب پر درخورِ مبارکباد سمجھتے ہیں جس سے انھوں نے اپنی بصیرتِ فرقانی اور ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سارے اسلامی لٹریچر میں اس کتاب کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اگر کہیں اس کتاب کو ہمارے کالجوں کے نصاب میں داخل کر لیا جائے تو اس سے قوم کی تقدیر بدل جائے، کیونکہ قوموں کی تقدیر ان کے نوجوان طبقہ کے قلب و دماغ کی تعمیر سے وابستہ ہوتی ہے۔

ادارۂ طلوع اسلام

الہام

(پرویز)

مجلہ فیض الاسلام، راولپنڈی میں محترم سید جعفر شاہ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "وحی سے ہمارا تعلق"۔ محترم شاہ صاحب نے یہ مضمون اشاعت سے پہلے ازراہ نوازش مجھے دیکھنے کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ مضمون محنت اور کاوش سے لکھا گیا تھا لیکن مجھے اس کے بعض مقامات سے اختلاف تھا جن کی طرف میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "الہام کی کوئی دینی حیثیت بھی ہے۔ محترم شاہ صاحب نے میرے عریضہ کا جواب بھی مرحمت فرمایا تھا لیکن اس سے میرا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہ سوال ایسا اہم ہے جس پر ذرا تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

محترم شاہ صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا تھا کہ رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے تین چیزیں عطا ہوئی تھیں۔

(۱) وحی

(۲) الہام۔ اور

(۳) بصیرت

وحی اور الہام میں انھوں نے فرق یہ بتایا تھا کہ وحی میں مفہوم کے ساتھ الفاظ بھی منزل من اللہ ہوتے ہیں لیکن الہام میں صرف مفہوم خدا کی طرف سے القا کیا جاتا ہے جسے پیغمبر اپنے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ الہام کے متعلق مزید ارشاد تھا کہ وہ اولیاء اللہ کو بھی عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ تھے:۔

> اس طرح کے مجرد خیالات عام انسانوں کے دماغ میں ڈالے جاتے ہیں۔ اولیائے مقربین کے دماغوں میں بھی القا کئے جاتے ہیں اور انبیائے مرسلین کے قلوب مطہر پر بھی الہام کئے جاتے ہیں اور وحی کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے۔ اس وحی میں ایک پیغمبر اس طرح ایک ولی کی سطح پر ہوتا ہے جس طرح ایک ولی تکوین وحی میں مگس شہد کی سطح پر ہوتا ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود جس طرح ایک ولی مگس سے ایک بلند تر وحی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پیغمبر اولیاء سے ایک بالاتر وحی کا بھی مہبط ہوتا ہے ..... یہ (بالاتر) وحی کسی غیر نبی کسی ولی اور کسی دوسرے مقرب پر نہیں ہوتی۔ وہی وہ فصل ہے جو ایک پیغمبر کو دوسرے اصحاب وحی سے ممتاز کرتی ہے ..... اسی کو ما انزل اللہ کہا جاتا ہے۔ ما انزل اللہ اور الہام کا سب سے بڑا قرآنی فرق یہ ہے کہ ہر الہام کا دوسروں تک پہنچانا (تبلیغ و ابلاغ) ضروری نہیں۔

اس کا بلاغ نہ فرائض ولایت میں ہے نہ فرائض رسالت میں داخل ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس غیر ملفوظ وحی (الہام) کو مانے بغیر چارہ کار نہیں۔

اس وحی غیر ملفوظ (الہام) کی ضرورت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

احادیث تنزیل نہیں بلکہ یا تو الہام نبوی ہیں یا بصیرتِ بشری۔ عقل و فہم سے بڑا درجہ ہے فراست کا اور فراست سے بڑا درجہ ہے بصیرت کا۔ الہام کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں عقل، فراست اور بصیرت کسی کی رسائی نہ ہو۔ احادیث میں الہام نبوی کا حصہ بہت تھوڑا ہے اور معاملات میں تو بہت ہی شاذ ہے۔ عقائد سب کے سب مکمل طور پر تنزیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مناسک کا (جسے عام طور پر عبادات کہتے ہیں) البتہ الہام سے زیادہ تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اخلاق کا تعلق زیادہ تر اور اکثر و بیشتر بصیرت ہی سے ہے۔ باقی رہے معاملات۔ سو حدود، اُن کی بھی تنزیل ہی نے بتا دی ہے لیکن ان کی تفصیلات کا تعلق سراسر عقل و بصیرت سے ہے۔

یعنی شاہ صاحب کے خیال کے مطابق

(۱) عقائد سب کے سب وحی خداوندی ہیں۔

(۲) اخلاق کا تعلق پیغمبرانہ فراست سے ہے۔

(۳) معاملات کی "حدود" منزل من اللہ ہیں لیکن ان کی جزئیات کا تعلق عقل و بصیرت سے ہے۔

(۴) عبادات کی تفاصیل کا تعین الہام کے ذریعے کیا گیا ہے۔

یہ اس لئے کہ محترم شاہ صاحب کے الفاظ میں

عقائد گھڑی گھڑی بدلنے والی حقیقتیں ہیں جو ہر موقعہ پر ترمیم و اضافہ کرنے کے لئے صرف حدود کھینچ دی جائیں اور ضرورت کے مطابق اس میں ردوبدل کی گنجائش رکھی جائے۔ اس لئے عقائد کو مکمل طور پر تنزیل نے اپنے ذمے لے لیا۔

مناسک (مراسمِ اظہارِ عقیدت) کا بھی قریباً یہی حال ہے لیکن اس کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے اور بعض مجبوری کے مواقع پر زمان و مکان اور طریق ادا وغیرہ میں ردوبدل کی بھی ضرورت ممکن ہے۔ اس لئے اس کے اصول و ارکانِ ضروریہ تو تنزیل ہی سے متعلق ہیں لیکن کچھ تفصیلات کا تعلق الہام سے ہے اور بعض جزئیات کا تعلق بصیرت و عقل سے بھی ہے۔

اخلاق کی قدریں بھی غیر متبدل ہیں اس لئے تنزیل ہی نے اسے بھی مکمل کر دیا ہے۔ اگر ضرورت داعیہ کچھ جزئی تفصیلات کا مطالبہ کرے تو اس کیلئے الہام کی ضرورت نہیں۔ بصیرت کافی ہے۔

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان کی حدود تنزیل نے اپنے ذمے لے لی ہیں اور جزئی تفصیل کو بصیرت ہی پر چھوڑ دیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک عقائد، اخلاق اور معاملات کا تعلق ہے، محترم شاہ صاحب میرے اس مسلک سے متفق ہیں جسے میں

ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں۔ البتہ "عبادات" کے متعلق ان کا خیال ہے کہ جو تفاصیل قرآن نے متعین نہیں کیں، انھیں رسول اللہؐ نے بذریعہ الہام متعین فرما دیا تھا یعنی وحیٔ غیر محفوظ کی رُو سے۔ اتنے حصے میں محترم شاہ صاحب ان حضرات سے متفق ہیں جو وحی کی دو قسمیں تسلیم کرتے ہیں۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو اس باب میں شاہ صاحب اور وہ حضرات ایک ہی مسلک کے پیرو ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ حضرات اخلاق، معاملات اور عبادات، سب کو وحیٔ غیر متلو کے دائرہ کے اندر تصور کرتے ہیں لیکن شاہ صاحب اس وحی (الہام) کا دائرہ صرف عبادات تک محدود قرار دیتے ہیں۔ گویا اصولاً دونوں متفق ہیں۔ فرق صرف تفصیلِ اطلاق میں ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی فرماتے ہیں کہ

اس الہامی وحی کو اگر حضورؐ نے مثلاً معہٗ یعنی مثل تنزیل مع تنزیل فرما دیا ہو تو اس پر حیرت و استعجاب کے اظہار کی خاص ضرورت نہیں

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہوگی کہ "الہامی وحی" وہی کچھ ہے جسے عام طور پر "وحی غیر متلو" یا "وحی خفی" کہا جاتا ہے۔ وحی غیر متلو کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کے بعد "وحی الہامی" کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن چونکہ محترم شاہ صاحب نے الہام کا ذکر چھیڑ کر اس میں اولیاء اللہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسلئے الہام کے متعلق گفتگو ضروری معلوم ہوئی کیونکہ اس سے پہلے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس عنوان پر طلوعِ اسلام میں کچھ نہیں لکھا گیا (اگرچہ معارف القرآن کی دوسری جلد میں وحی کے عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بحث آچکی ہے)

میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کو اس باب میں لکھا تھا:-[1]

① اب رہ گیا الہام۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں انبیاء اور اولیاء دونوں شامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے لئے قرآنی سند درکار ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کوئی ایسی چیز ہے جسے الہام کہتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اس الہام کی اتباع بھی ایمان لانے والوں پر واجب ہوتی ہے، اسی طرح جس طرح وحی کی اتباع واجب ہوتی ہے۔ اگر الہام کی اتباع بھی واجب ہوتی ہے تو یہ دین کا جزو ٹھہرا۔ اس لئے اسے، دین کے جزو اول (وحی)

② کی طرح یقینی طور پر محفوظ شکل میں امت کے پاس ہونا چاہئے۔ اور اگر اس الہام کی اتباع واجب نہیں ہوتی تو اس کی حیثیت دین کی نہ رہی۔ لہٰذا اس صورت میں یہ بات خارج از بحث ہوگی کہ الہام کی نوعیت کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا؟

③ اگر اس کی حیثیت دین کی ہوتی ہے تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اولیاء کے الہام کی حیثیت بھی دین کی ہونی چاہئے۔ کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق الہام میں انبیاء اور اولیاء دونوں شریک ہوتے ہیں اور دونوں کے الہام کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو امت کے لئے ہر ولی کے الہام پر ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا بھی جزو دین قرار پا جائے گا۔

---

[1] میں اس خط اور شاہ صاحب کے جواب کے اقتباسات اسلئے پیش کر رہا ہوں کہ محترم شاہ صاحب نے انھیں اپنے مضمون کے ساتھ شائع فرما دیا ہے اسلئے یہ خط و کتابت نجی نہ رہی ورنہ میں اس خط و کتابت کا حوالہ نہ دیتا جب تک محترم شاہ صاحب سے اس کی اجازت نہ لے لیتا۔ پرویز

اس کے جواب میں محترم شاہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا:-

(۱) قرآنی سند۔ حضرت یوکبدؑ (حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ) پر خدا ہی کی طرف سے وحی الہامی ہوئی تھی۔ واوحینا الیٰ ام موسیٰ۔ اور ظاہر ہے کہ یوکبدؑ نبیہ نہ تھیں حضرت یوسفؑ کے ساتھ بھی قبل از نبوت یہی ہوا تھا[1]۔ اتنی سند وحی الہامی کیلئے کافی ہے اور وحی تنزیلی کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں۔

(۵) الہام کی حفاظت۔ ایسی وحی (جو محفوظ کرلی گئی ہو) صرف قرآن میں محفوظ ہے اور اسی کو ہم نے تنزیلی وحی کہا ہے۔ الہامی وحی کو تسلیم کرلینے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا[2]۔ الہامی وحی کو بھی ہم نے زیادہ سے زیادہ فقط عبادات و مناسک میں منحصر کیا ہے۔ وہ بھی فقط اپنے رجحان کے اظہار کے طور پہ[3] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاملات کو خارج از الہام ثابت کرنے کیلئے اتنے مواد موجود ہیں کہ مخاصم کا ٹھہرنا قریباً ناممکن ہے۔ ہمیں سب سے پہلے ہی مورچہ فتح کرلیا ہے[4]۔

(۳) اتباعِ الہام۔ انبیاء اور اولیا دونوں کے الہامی وحی کا سرچشمہ ایک ہونے کے باوجود اس کی حیثیتِ اتباع میں یقیناً فرق رہے گا۔ اسلئے کہ نبی کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہے لیکن کسی ولی کی ولایت پر ایمان لانا کوئی جزو دین نہیں مسٹر لیاقت علی خاں اگر قانونِ پاکستان کے مطابق کوئی حکم دیں تو آپ کو ماننا پڑے گا لیکن اگر وہی حکم علامہ سید سلیمان ندوی دیں تو آپ ماننے پر مجبور نہیں ہوں گے حالانکہ دونوں کا حکم یکساں اور دونوں حکموں کا سرچشمہ ایک ہی کتاب آئین ہوگا[5]۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ

---

[1] ان مثالوں کی تفصیل ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

[2] سوال یہ نہیں تھا کہ وحی الہامی کو تسلیم کرلینے سے وحی تنزیلی میں فرق آجاتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اگر وحی الہامی دین کا جزو تھی تو اسے بھی وحی تنزیلی کی طرح محفوظ ہونا چاہئے تھا۔ اس کا جواب نہیں دیا گیا۔

[3] ذاتی رجحان کا دین میں کیا دخل؟ ایک چیز کے متعلق آپ کا دعویٰ ہے کہ اس کی سند قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہؐ نے عبادات کی جزئیات اس کی رو سے متعین فرمائی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسی اہم چیز کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے ایسا فقط اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کیا ہے؟

[4] سوال فریقِ مخاصم کو شکست دینے کا نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے حقیقت کیا ہے؟ اگر کوئی بات قرآن سے ثابت ہوجائے اور اس سے ہمارے بڑے سے بڑے دعوے کی شکست ہوجائے تو یہ شکست اس فتح سے ہزار درجہ افضل ہے جو ہمیں اس دلیل سے حاصل ہوجائے جس کی سند قرآن سے نہ ملتی ہو۔

[5] اگر سید صاحب کا حکم ماننا ضروری نہیں ہوگا تو پھر آئین پاکستان کے ضمن میں سید صاحب کا تذکرہ ہی بے معنی ہے۔ جب ان کی حیثیت ہی کچھ نہیں تو کسی کو اس سے کیا واسطہ کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں!

نیز یہ بھی واضح ہے کہ پاکستان کی رعایا ہونے کی جہت سے خود سید صاحب پر بھی لیاقت علی خاں صاحب کے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔ اس صورت میں اگر اللہ تعالیٰ سید صاحب پر کچھ الہام کرتا ہے تو اس الہام سے بالآخر فائدہ کیا جو نہ دوسروں کے ماننے کے لئے ہے اور نہ خود صاحبِ الہام کے ماننے کے لئے۔ تختہ مسجد نہ قابلِ سوختن نہ درخور فروختن۔ پھر اس اللہ میاں کے متعلق کیا سمجھا جائے جو اس قسم کے الہام القا کرتا ہے جس کا فائدہ نہ صاحبِ الہام کو ہو نہ کسی اور کو۔ بقول غالب

زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو ۔۔۔ کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

رسول کا کوئی حکم الہامی نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شخصیت یا کسی زمان و مکان کے ساتھ مختص ہو یا قابل تاویل ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تھا محترم شاہ صاحب کا وہ جواب جس سے میں مطمئن نہ ہو سکا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ

(۱) کیا قرآن کی رو سے الہام کی کوئی دینی حیثیت ہے۔

(۲) کیا رسول اللہؐ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے کوئی اور وحی بھی ملی تھی جسے "الہامی وحی" کہا گیا ہے۔ اگر ملی تھی اور اس کی حیثیت دین کی تھی تو اسے بھی وحی تنزیل کی طرح محفوظ کیوں نہ رکھا گیا۔

(۳) کیا اولیاء کرام کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر ہوتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

آیئے۔ ان سوالات کے متعلق ہم دیکھیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ اس لئے کہ دین کے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو اس سے پوچھنا چاہئے جس نے ہمیں دین عطا کیا ہے۔ دین، اللہ نے دیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس باب میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اور اللہ نے جو کچھ کہنا تھا وہ قرآن میں کہہ دیا۔ اس لئے ہمیں دین کے متعلق ہر باب میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ میرا یہی مسلک ہے اور آرزو یہی ہے کہ میں یہی مسلک لیکر اللہ کے سامنے جاؤں۔

الہام الہام، لہم سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا نگل لینا ہے۔ الہم کے معنی ہیں کسی شے کا کسی کے اندر ڈال دینا۔ الہام کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ الہم کا لفظ ایک مقام پر آیا ہے جہاں فرمایا:۔

ونفسٍ وما سوّٰھا۔ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔ (۹۱/۷)

نفسِ انسانی اور وہ قوتیں جو اسے درست رکھتی ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر تشتت ہو کر برباد ہو جانے اور قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو کر نشو و نما پا لینے کی امکانی قوتیں رکھ دی ہیں۔

یہ آیات جلیلہ میرے متعدد مضامین میں اتنی مرتبہ دہرائی جا چکی ہے کہ اس مقام پر ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ الھمھا کے لفظ کے کیا معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں "خدا نے نفسِ انسان کے اندر یہ امکانی قوتیں رکھ دیں"۔ عام طور پر اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ "اللہ نے نفسِ انسانی کو نیکی اور بدی کا علم دیدیا"۔ میں اپنے ایک مضمون میں بتا چکا ہوں کہ یہ معنی بہ وجوہ درست نہیں۔ لیکن اس وقت اس نکتہ کے متعلق بحث نہیں۔ اگر اس کے معنی یہ بھی لے لئے جائیں تو بھی یہ آیت اس بات کی سند نہیں قرار پا سکتی کہ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کرام یا اولیاء مقربین کو الہام کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں "نفسِ انسانی" کے الہام کا ذکر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں۔ چہ جائیکہ عام مومن اور انبیاء اور اولیاء کی تخصیص ہو۔ لہٰذا یہ آیت مقصد پیش نظر کے لئے مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔

قرآن میں صرف اسی ایک مقام پر الہام کا ذکر ہے اور اس مقام سے ظاہر ہے کہ یہ وہ الہام نہیں جو حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف کیا جاتا ہو۔ قرآن کی رو سے براہ راست بحث تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے الہام کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن دوسرے انداز سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام اور غیر انبیاء کو الہام ہوتا ہے۔ محترم شاہ صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہی دلیل پیش کی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بعض مقامات پر وحی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنی وہ وحی نہیں جو حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل ہوتی ہے بلکہ اس کے معنی الہام کے ہیں۔ اب آیئے اس دلیل کی طرف۔

وحی لفظ وحی کے معنی ہیں "خفیف لیکن بہت تیز اشارہ"۔ قرآن میں یہ لفظ اشارے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت زکریاؑ کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے:۔

فخرج علیٰ قومہ من المحراب فاوحیٰ الیھم (۱۹/۱۱)

وہ محراب سے اپنی قوم کی طرف آیا اور انہیں اشارے سے کہا۔۔۔۔۔

دوسرے مقام پر بحیثیت فطرت انسانوں کی باہمی خفیہ سازشوں اور اشارات و کنایات سے گفتگو کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وان الشیٰطین لیوحون الیٰ اولیاءھم (۶/۱۲۱ نیز ۶/۱۱۲)

اور شیاطین اپنے دوستوں سے اشاروں میں خفیہ سازشوں کی باتیں کرتے ہیں۔

جس قانون کی رو سے آفاقی کائنات کا نظم و نسق جاری ہے اس کے لئے بھی وحی کا لفظ آیا ہے۔

اوحیٰ فی کل سماء امرھا (۴۱/۱۲)

اللہ نے ہر سمار میں اپنا امر وحی کر دیا۔

زمین کے متعلق ہے کہ وہ اپنے "اثقال" نکال باہر کرے گی۔

بان ربک اوحیٰ لھا (زلزلت)

کیونکہ تیرا رب اسے اس کی وحی کرے گا۔

شہد کی مکھی کے متعلق بھی ہے کہ خدا نے اسے وحی کی (اوحیٰ ربک الی النحل۔ سورۂ نحل) کہ وہ کس طرح اپنا چھتہ بنائے اور اسے شہد سے بھر دے۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا کہ

اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا۔۔۔ (۸)

جب تیرے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم جماعت مومنین کو ثابت قدم رکھنا۔

ان مقامات میں وحی کے معنی امرِ الٰہی کے ہیں۔ کائنات اور نوامیسِ فطرت میں امرِ الٰہی (امرِ تکوینی) کس طرح نفاذ پذیر ہوتا ہے ہم اسے نہیں جان سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے جس کی رُو سے کارگہ فطرت اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ ہم اس قانون کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے نتائج کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے، اس راز کو نہیں پا سکتے۔

وحی کے متعلق اب دوسری قسم کی مثالیں لیجئے۔ ان آیات میں اس وحی کا ذکر ہے جو خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل کی جاتی تھی۔ یہ صرف خاصۂ نبوت تھا اور کوئی غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہ تھا۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح . . . . الخ (۴/۱۶۳)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ کی طرف اور دوسرے انبیاء کی طرف جو اس کے بعد آئے وحی بھیجی تھی۔ اور وحی بھیجی تھی ابراہیمؑ کی طرف اور اسمٰعیلؑ کی طرف۔ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی طرف۔ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف۔ اور داؤدؑ کو ہم نے زبور عطا کی تھی . . . . . .

اس وحی کی خصوصیت یہ تھی کہ خود رسول اس کی اتباع کرتا تھا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے۔

اتبع ما یوحی الیک (۶/۱۰۶)

اور جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو۔

اور اسی وحی کی رُو سے نبی اکرمؐ، نوعِ انسانی کو غلط نظامِ زندگی کے نتائج اور عواقب سے آگاہ کرتے تھے۔

قل انما انذرکم بالوحی (۲۱/۴۵)

ان سے کہدو کہ میں تمہیں صرف وحی خداوندی کی رو سے آگاہ کرتا ہوں۔

اسی وحی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ۔ (۶/۱۹)

اور میری طرف اس قرآن کو وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور ان تمام انسانوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے آگاہ کردوں

حضورؐ کی حیثیتِ رسالت اسی وحی قرآنی کی رُو سے تھی۔ اس کے علاوہ باقی حیثیت بشری تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد (۱۸/۱۱۰)

ان سے کہدو کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اس امتیاز کے ساتھ کہ میری طرف وحی ہوتی ہے کہ تمہارا الٰہ فقط الٰہ واحد ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ وحی قرآن کے اندر ہے اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے۔ لہٰذا یہی وہ ملفوظ اور محفوظ وحی ہے جو رسول اللہؐ کی طرف نازل ہوئی اور جس کی اتباع ہر مومن پر لازم ہے۔ یہ یقینی ہے، ظنی نہیں۔ حق ہے، باطل اس کے قریب نہیں

بھٹک سکتا۔ یہی دین ہے اور یہی اللہ کی طرف سے حجت اور سند۔ اس وحی کی کنہ وحقیقت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ یہ خاصۂ نبوت ہے اور مقامِ نبوت حیطۂ ادراک سے ماوراء ہے۔ معلوم نہیں اس کا نزول انبیائے کرام کی طرف کس طرح ہوتا تھا۔ نبی کے علاوہ کوئی انسان اس حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ اور اب چونکہ نبوت بھی ختم ہو چکی ہے اس لئے ہم وحی کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اور ہمارے لئے زندگی کا ضابطہ۔ قوانینِ فطرت کی طرح اسکی صداقت بھی اس کے نتائج سے مشہود ہو جاتی ہے۔

اب وہ تیسری مثال لیجئے جہاں وحی کا لفظ انبیائے کرامؑ کے علاوہ دوسرے انسانوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق ہے:

واذ اوحیت الی الحواریین ان اٰمنوا بی وبرسولی - (۵/۱۱۱)

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔

(۲) یہ قصہ سب کو معلوم ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت پر ان کی والدہ کے دل میں تردد لاحق ہوا کہ اس بچے کے متعلق کیا کیا جائے۔ فرعونی لوگوں کو پتہ چل جانے پر اسے بھی مار دیا جائے گا۔ اس موقعہ پر قرآن میں ہے:۔

واذ اوحینا الی امك ما یوحیٰ - ان اقذفیه فی التابوت ... الخ (۲۰/۳۸)

(اے موسیٰ) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی کہ وہ تجھے ایک صندوق میں ڈال دے اور اس صندوق کو دریا میں بہا دے . . . . .

(۳) تیسری آیت حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے جب ان کے بھائیوں نے انھیں کنوئیں میں ڈال دیا تو قرآن میں ہے:۔

واوحینا الیه لتنبئنهم بامرهم هذا وهم لا یشعرون - (۱۲/۱۵)

ہم نے یوسف کی طرف وحی کی کہ تو انھیں ان کی اس کرتوت کے متعلق خبر دے گا درانحالیکہ وہ نہیں سمجھتے ہوں گے۔

یہ ہیں وہ مقامات جن سے محترم شاہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے جس میں نبی اور غیرنبی سب شامل ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ الہام تھا جس کی رو سے رسول اللہ عبادات سے متعلق اصولی احکام کی جزئیات متعین فرماتے تھے۔ یعنی حضورؐ کی طرف دو قسم کی وحی ہوتی تھی۔

(۱) وہ وحی جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اور

(۱۱) وہ وحی جو قرآن میں نہیں، اسے الہام کہا جائے گا۔

اور یہ "الہامی وحی" اولیاء کرام کی طرف بھی نازل ہوتی ہے لیکن اس کی حیثیت ایک نبی کی "الہامی وحی" کے برابر نہیں ہوتی۔

یہی مقام غور طلب ہے۔

ان مثالوں میں ایک مثال حضرت یوسفؑ کی ہے جو رسول تھے۔ لیکن محترم شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب

حضرت یوسفؑ ہنوز شرفِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال، باقی دو مثالیں یقیناً ایسی ہیں جن میں وحی کے لفظ کا استعمال غیر انبیاء کے لئے ہوا ہے۔ لیکن آپ ان مثالوں پر غور کیجئے۔ ان میں وحی کا لفظ صاف ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ "میں نے بہت سوچا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں اسی عالم میں بیٹھا تھا کہ یونہی میرے جی میں آیا کہ ذرا اس طرح کرکے دیکھوں میں نے یوں کیا اور معاملہ صاف ہوگیا۔" یا اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ "میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی۔ میرے دل میں اللہ نے یونہی ڈال دیا کہ . . . ." مذکورہ صدر مثالوں میں "اوحینا" کے معنی یہی ہیں کہ "ہم نے امِ موسیٰؑ کے جی میں یہ ڈال دیا کہ وہ بچے کو صندوق میں بند کرکے دریا میں بہادے۔" یا "ہم نے حواریوں کے دل میں یہ بات ڈالدی کہ وہ ایمان لے آئیں۔"

کہدیا جائے گا کہ ان باتوں کو ان کے دل میں اللہ نے ڈالا تھا۔ یونہی خود بخود ان کے جی میں نہیں آگئی تھیں۔ اسی کو الہام کہتے ہیں۔

لیکن محض اتنی سی بات سے کہ ان مثالوں میں اللہ نے وحی (دل میں بات ڈالنے) کی نسبت اپنی طرف کی ہے، الہام کے لئے سند نہیں لی جاسکتی۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ اس میں کئی ایسے امور کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا مقصود نہیں ہوتا کہ ان کا فاعل خدا ہے۔ کہنا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق سرزد ہوتی ہیں اور چونکہ وہ قاعدہ اور قانون خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس لئے ان کی نسبت خدا اپنی طرف کرلیتا ہے۔ سارا قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم (خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی) میں "مہر لگانے" کی نسبت خدا کی طرف ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ مہریں انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یا مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

واذا اردنا ان نھلك قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنھا تدمیرا (۱۷/۱۶)

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کردیں تو اس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ فسق شروع کردیتے ہیں اور اس طرح ان پر سزا واجب ہوجاتی ہے تو انھیں تباہ و برباد کردیا جاتا ہے۔

یہاں بالکل واضح ہے کہ

(۱) خدا یونہی بیٹھے بیٹھے یہ ارادہ نہیں کرلیتا کہ آؤ فلاں بستی کو ہلاک کردیں۔ بستی والوں کے اعمال خود ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔

(۲) خدا مترفین (عیش پرست لوگوں) کو حکم نہیں دیتا کہ وہ فسق شروع کردیں۔ وہ ایسے کام خود اپنی خواہشات کی رو سے کرتے ہیں۔

یعنی یہ سب کچھ ان قاعدوں اور اصولوں کے مطابق ہوتا ہے جو قوموں کی موت اور زندگی کے متعلق کارفرما ہیں۔ لیکن ان کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے۔ یہ قرآن کا خاص انداز ہے۔ اس لئے حواریوں کی طرف اور امِ موسیٰؑ کی طرف وحی کرنے (یعنی ان کے دل میں بات ڈالنے) کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے تو یہ اسی انداز کی رو سے ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ جس انداز سے حضرت موسیٰؑ کو، پیدائش کے ساتھ ہی، فرعونی شکنجوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا گیا اور آپؑ کی پرورش خود فرعون کے گھر کے اندر کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مشیت کے اس پروگرام کے مطابق تھا، جو ایک رسول کی زندگی کے سلسلہ میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس لئے امِ موسیٰؑ کے دل میں یہ بات یونہی نہیں آگئی تھی بلکہ مشیت خداوندی کے مطابق پیدا کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے

میں اس سے متفق ہوں (اور میں نے معارف القرآن جلد سوم میں اس کی یہی توجیہہ بیان کی ہے۔ یعنی یہ بات منجانب اللہ تھی)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ رسول اللہؐ کی طرف دو قسم کی وحی ہوا کرتی تھی۔ ایک وہ جو قرآن میں محفوظ ہے اور دوسری وہ جو محفوظ و ملفوظ نہیں، لیکن بایں ہمہ جزوِ دین ہے۔ اس امر کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ قرآن نے نہ تو رسول اللہؐ کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں بیان کی ہیں اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ قرآن کے باہر کہیں اور بھی وحی مل سکتی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ جو وحی رسول اللہؐ کی طرف آئی تھی وہ اسی قرآن میں ہے۔ (اوحی الی ھذا القرآن)۔ قرآن ہی وحی کیا گیا تھا۔ (نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا الیك ھذا القرآن وان کنت من قبلہ لمن الغافلین ۱۲/۳) اس لئے یہ کہنا کہ رسول اللہؐ کی طرف دو قسم کی وحی آتی تھی۔ اور اس میں سے ایک وحی قرآن کے اندر ہے اور دوسری قرآن کے باہر، قرآنی تصریحات کے یکسر خلاف ہے اور اپنے ذہن کی تخلیق (یا محترم شاہ صاحب کے خود اپنے الفاظ میں 'ذاتی رجحان کا نتیجہ)۔

ذرا سوچئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت کیا لاحق ہوئی کہ دین کا کچھ حصہ ایک قسم کی وحی کے ذریعے نازل کرے اور کچھ حصہ دوسری قسم کی وحی کے ذریعے جسے روایت پرست حضرات وحی غیر متلو سے تعبیر کرتے ہیں اور محترم شاہ صاحب اس کا نام "الہامی وحی" رکھتے ہیں۔ وحی غیر متلو کے معنی ہیں ایسی وحی جس کی تلاوت نہ کی جائے۔ یعنی اسے قرآن میں نہ رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وحی ایسی تھی جسے اللہ (معاذ اللہ) قرآن پڑھنے والوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اس لئے اس نے ایسی تدبیر اختیار کی جس سے رسولؐ تک تو وحی پہنچ جائے لیکن وہ قرآن پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے نہ آئے۔ محترم شاہ صاحب نے اسے "الہامی وحی" قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ یہ وحی قرآن پڑھنے والوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل رہے اور جبریلِ امین کو بھی اس کا پتہ نہ چلے۔ یعنی اسے براہِ راست رسول اللہؐ کے دل میں ڈالدیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا جائے کہ اسے قرآن میں نہ داخل کرنا کیونکہ قرآن کو مسلمان روز پڑھتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس وحی کی تلاوت کی جائے! سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ وہ وحی کیلئے اس قسم کی بالواسطہ تدابیر (Indirect Methods) اختیار کرے۔ قرآن شاہد ہے کہ رسول اللہؐ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملتا تھا حضورؐ خود اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسے قرآن میں شامل کرتے تھے۔ اس کا ایک ایک حرف دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ اور یہی وحی اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ اس وحی کے بغیر حضورؐ کی حیثیت بشری تھی اور اس حیثیت کا نتیجہ تھی وہ بصیرت جس میں تمام انسان (اپنی اپنی استعداد کے مطابق) شریک ہوتے ہیں۔ یہی وہ بصیرت تھی جس کی رو سے خود حضورؐ خدا کی طرف دعوت دیتے تھے اور حضورؐ کے متبعین بھی۔ ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۸) "ان سے کہدیجئے کہ میں اللہ کی طرف برینائے بصیرت دعوت دیتا ہوں اور جو میری متابعت کریں گے وہ بھی اسی طرح اللہ کی طرف دعوت دینگے"۔ یہی وہ بصیرت تھی جس کی بنا پر حضورؐ ان احکاماتِ الٰہیہ کی جزئیات متعین فرماتے تھے جن کے صرف اصول، قرآن میں آئے ہیں۔ محترم شاہ صاحب 'اخلاق اور معاملات' کی حد تک تو اس کے قائل ہیں کہ حضورؐ قرآن کے اصولی احکام کی تفصیلات، اپنی بصیرت کی رو سے متعین فرماتے تھے لیکن "عبادات" کے معاملہ میں ان کا خیال ہے کہ رسول اللہؐ کی بصیرت کافی نہ تھی۔ اس کیلئے بصیرت کے اوپر اور وحیٔ قرآنی کے نیچے' کچھ اور ہونا چاہیے۔ اسی "بین بین" کے لئے انھوں نے

"الہامی وحی" کی اصطلاح وضع فرمائی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق و معاملات اور عبادات کے اصولوں کی تفاصیل مرتب کرنے کے لئے اس قسم کی تمیز و تفریق کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ جو اصول اخلاق و معاملات کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے وہی اصول عبادات کے متعلق بھی کیوں نہ اختیار کیا جائے؟ آپ مانتے ہیں کہ

(۱) قرآن کریم میں ایسے احکام ہیں جن کے صرف اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔

آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ

(۲) ان اصولی احکام کی جزئیات رسول اللہؐ نے متعین فرمائی تھیں۔

لیکن اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ

(۳) رسول اللہؐ نے ان اصولی احکام میں سے اخلاق و معاملات کی جزئیات تو اپنی بصیرت کی بنا پر مرتب فرمائی تھیں لیکن عبادات کی جزئیات ایک اور طریقے سے متعین کی تھیں جسے "وحی الہامی" کہا جاتا ہے؟

ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ شق ۳ میں اخلاق و معاملات اور عبادات میں تخصیص کی کوئی وجہ اور اس کی کوئی قرآنی سند؟

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائیگی کہ "عبادات" کو "معاملات" سے الگ کرنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر وہی خیال کارفرما ہے جو مذہب نے "دین اور دنیا" کی تفریق کے سلسلہ میں پیدا کر رکھا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اخلاق اور معاملات کا تعلق دنیاوی اور معاشری امور سے ہے اسلئے یہ انسانی بصیرت کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ لیکن "عبادات" کا تعلق "خدا" سے ہے، اسلئے اسے بصیرت کی دسترس سے باہر ہونا چاہئے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی رو سے "عبادات" کے لئے بصیرت سے اونچے ذریعۂ علم کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہ خیال اس قدر عام اور اتنے عرصے سے مسلسل چلا آرہا ہے کہ اس سے ذہن انسان کا (غیر شعوری طور پر) متاثر ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ اسی کو محترم شاہ صاحب نے "ذاتی رجحان" سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے "ذاتی رجحانات" درحقیقت نتیجہ ہوتے ہیں ان معتقدات و خیالات کا جو ہمیں وراثتی طور پر ملتے ہیں یا جو اس ماحول میں منتشر ہوتے ہیں جس میں ہم پرورش و تربیت پاتے ہیں۔ لیکن قرآن کو محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہم اپنے "ذاتی رجحانات" کو اس کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ جو اس پر پورے اتریں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں حریم قلب میں جگہ دی جائے۔ جنھیں وہاں سے سند صحت و صواب نہ ملے، انھیں کاشانۂ دماغ سے فوراً نکال باہر کیا جائے خواہ ان کے ساتھ کیسی ہی حسین یادداشتیں اور مقدس نسبتیں وابستہ کیوں نہ ہوں، کہ لات و منات، لات و منات ہی رہتے ہیں خواہ انھیں خود کعبہ کے اندر بھی کیوں نہ نصب کر دیا جائے۔

قرآن، اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ سب ایک ہی نظام کے اجزاء اور ایک ہی مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ پانی، ہوا، مٹی، حرارت، روشنی، سب مل کر (بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر) بیج کے تناور درخت بننے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیکھئے! قرآن جہاں مومنین کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ هم فی صلاتهم خاشعون (وہ اپنی صلوٰۃ میں خشوع برتتے ہیں) ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ هم عن اللغو معرضون (وہ لغوبات سے اعراض برتتے ہیں)۔ جہاں کہتا ہے هم للزكوة فاعلون (وہ زکوۃ کا نظم و نسق کرتے ہیں)۔ وہیں کہتا ہے کہ هم لفروجهم حافظون (وہ جنسی تعلقات میں حدود اللہ کی نگہداشت کرتے ہیں)۔ جہاں کہتا ہے کہ

ھم لامانٰتھم وعھدھم راعون (وہ اپنی امانات اور عہد کی رعایت کرتے ہیں) اس کے ساتھ ہی کہتا ہے کہ ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون[1]۔ (وہ اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں)۔ غور فرمایا آپ نے کہ کس طرح اخلاق و معاملات و عبادات، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، قدم بقدم ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اسلام کے نظام میں عبادات، اخلاق و معاملات کے سنوارنے کا ذریعہ ہیں[2] اس طرح سنورے ہوئے اخلاق و معاملات خود عبادت بن جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ اخلاق اور معاملات، انسان اور انسان کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہیں اور عبادات، انسان اور خدا کے نجی تعلق کا نام ہے، اسلامی نظام کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اسلامی نظام میں عبادات کا تعلق براہ راست معاملات سے ہے۔ عبدیت (عبودیت۔ عبادت) کے معنی ہی قوانین خداوندی کی اطاعت اور محکومی ہے۔ یہ تصور کہ عبادت کا مفہوم "خدا کی پرستش" (پوجا پاٹ) ہے مذہب کا پیدا کردہ ہے دین کا نہیں[2]۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات "مذہب پرست" لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ "عبادت" کس طرح معاملات کی دنیا میں دخل انداز ہو سکتی ہے؟ یہی وہ الجھن تھی جسے قوم شعیبؑ نے حضرت شعیبؑ کے سامنے اس تنقیدی انداز میں پیش کیا تھا جب کہا تھا کہ

قالوا یٰشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد اٰباءنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشٰؤا (۱۱/۸۷)

انھوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ بھی حکم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی "عبادت" ہمارے آبا کرتے تھے۔ اور ہم اپنا مال و دولت اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔

وہ سمجھتے تھے کہ نماز ایک عبادت ہے یعنی خدا کی پرستش۔ اسے اس بات سے کیا تعلق کہ ہم اپنا معاشی نظام کس قسم کا قائم کرتے ہیں! عبادات کو معاملات سے کیا واسطہ؟ یہی دلیل قوم شعیب پیش کرتی تھی اور یہی دلیل، تحریک پاکستان کے ضمن میں ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوا کرتی تھی جب وہ کہتے تھے کہ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق کا نام ہے۔ اسے حکومت و سیاست (یعنی معاملات) سے کیا واسطہ؟ یہی ہے وہ جذبہ جو آج ہمارے اعماق قلب میں بھی غیر شعوری طور پر مچلتا رہتا ہے اور جس کی رو سے ہم اپنے تحت الشعور میں سمجھتے ہیں کہ عبادت کو معاملات سے الگ اور بلند رکھنا چاہئے۔ اور یہی ہے وہ جذبہ جس کے ماتحت محترم شاہ صاحب اخلاق و معاملات کے اصولوں کی جزئیات کی تعیین کے لئے تو بصیرت کو کافی سمجھتے ہیں لیکن عبادتی اصولوں کی تفصیلات کے تعین کیلئے کسی الگ (اور بلند) ذریعے کی تلاش میں ہیں۔

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ قرآن، اخلاق و معاملات و عبادات میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلئے جو طریق کار اخلاق و معاملات کے قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا وہی طریق، عبادات کے قرآنی اصولوں کی تفصیلات کی تعیین کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ ان تمام تفاصیل کو نبی اکرمؐ نے اپنی بصیرت کی بنا پر متعین فرمایا تھا۔ بصیرت (جو قرآن کی

---

[1] یہ سب سورۂ مومنون کی مسلسل آیات ہیں۔

[2] میں دین اور مذہب میں جو فرق سمجھتا ہوں اسے متعدد بار ان صفحات میں بیان کر چکا ہوں اسلام دین ہے۔ یعنی نظام زندگی۔ "مذہب" نہیں۔ مذہب، دھرم کو کہتے ہیں۔

روشنی میں رد و بدل آئے) کوئی ایسی گھٹیا چیز نہیں جسے ہم اخلاق و معاملات سے تو وابستہ کر دیں لیکن اسے عبادات تک لے جانے میں جھجک محسوس کریں۔ آپ تو خود اس کے معترف ہیں کہ

> پیغمبر کی بصیرت و اجتہاد کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہوتی جسے ہم سرسری نظر سے دیکھ لیا کریں اور اسے معمولی درجہ دے کر ٹال جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے خود جزئیات متعین نہیں کیں بلکہ صرف اصولی احکام تک اکتفا کیا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ تھا کہ وہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی جزئیات میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے پیش نظر رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اگر ان جزئیات کو بھی قیامت تک کیلئے (قرآنی اصولوں کی طرح) غیر متبدل رہنا ہوتا تو ان کا تعین خود وحی کے ذریعے (قرآن کے اندر) کر دیا جاتا۔ ان جزئیات کا تعین، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، انسانی بصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ یہی رسول اللہؐ نے کیا تھا اور یہی حضورؐ کے بعد کیا جائے گا۔ ایسا کرنے کے کا نام سنت رسول اللہ کی اتباع ہے۔

باقی رہا اولیاء کرام کی طرف الہام خداوندی۔ سو اس کی سند قرآن سے کہیں نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اولیاء کرام کا جو تصور ہمارے ہاں عام ہے وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن کی رو سے ہر مومن ولی اللہ ہے۔ یعنی ولی اللہ (خدا کا مطیع و فرمانبردار) ہونا مومن کی خصوصیت یا صفت ہے۔ جس طرح ہر مومن صادق (سچا) ہوتا ہے، اسی طرح ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مومنین میں سے ایک خاص طبقہ اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی اتباع کرتے ہیں وہ مومنین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء اللہ۔ جو لوگ غیر خدائی قانون کی اتباع کرتے ہیں وہ کافرین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء الشیطان۔ قرآن نے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی اصطلاحات کا استعمال انہی معنوں میں کیا ہے۔ مومنین میں سے کسی الگ طبقہ کا نام اولیاء اللہ نہیں رکھا۔

اصل یہ ہے کہ ولایت کا تصور بھی "عجمی اسلام" کا پیدا کردہ ہے۔ اور اسلام کے خلاف اسی سازش کا نتیجہ جس کا ذکر ان صفحات میں کئی بار آ چکا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے جو سازش کی گئی اس کی پہلی کڑی یہ عقیدہ پیدا کرنا تھا کہ رسول اللہؐ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے، ایک اور وحی بھی دی گئی تھی جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) ہے۔ یہ وحی روایات میں ملتی ہے، اس لئے روایات عین دین ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی روایات سازی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے روایات کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ حالانکہ روایات کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا نہ خلفائے راشدینؓ نے مرتب کیا تھا۔ اس طرح اس دین کے مقابل جو اللہ نے دیا تھا "ایک اور "دین" مدون کر کے رکھ دیا اور اسے اتباعِ سنت رسول اللہؐ قرار دے کر امت کو اس میں الجھا دیا۔

لیکن جب روایات کے مجموعے مرتب ہو گئے تو مزید "دین سازی" کی گنجائش نہ رہی اب اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان عقل و بصیرت سے کام لینا نہ شروع کر دے۔ اس کیلئے الہام کا عقیدہ تراشا گیا۔ اور اس تصور کو عام کیا گیا کہ الہام چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے

ملتاہے اسلئے اس کا مقام عقل وبصیرت سے بہت اونچاہے۔ اب روایات کی بجائے اولیاء اللہ کے ملفوظات مرتب ہونے شروع ہوگئے۔ اور اس طرح ایک تیسرا متوازی (Parallel) "دین" پیدا ہوگیا۔ روایات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ قرآن کی ناسخ ہیں (اور دلیل یہ تھی کہ قرآن کا جو مفہوم رسول اللہ سمجھ سکتے تھے وہ دوسرے مسلمان کس طرح سمجھ سکتے ہیں) اب یہ "الہامات" قرآن اور روایات دونوں کے ناسخ قرار پاگئے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ دین کا یہ مفہوم براہ راست اللہ اور اس کے رسول کا سمجھایا ہوا ہے۔ اسلئے قرآن کے الفاظ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ ان الفاظ کا باطنی مفہوم بالکل ظاہر سے الگ ہے اور اس کا ذریعہ علم "سینہ بہ سینہ" علم لدنی" ہے۔ لیجئے۔ معاملہ صاف ہوگیا۔ روایات کیلئے تو پھر بھی دوچار راویوں کا نام لینا پڑتا تھا۔ الہامی ملفوظات کیلئے اس کی بھی ضرورت نہ رہی۔ روایات کیلئے اگر رسول اللہ کے اسم گرامی کی طرف نسبت، وجہ کشش تھی تو "الہامات" کے لئے اس سے بھی بڑی کشش، کشف وکرامات کا وجود تھا۔ اس کشش و دلیل کے سامنے کوئی اور جاذبیت و برہان کام نہیں دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الہامات کے یہ آستانے دھڑا دھڑ کعبۂ مقصود بننے شروع ہوگئے اور نہ صرف یہ کہ یہ کشش صاحبان کشف والہام کی زندگی تک ہی محدود رہی بلکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے مزارات سے لپٹ گئی۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے

یہ امت خرافات میں کھو گئی

وحی کا دروازہ قرآن سے بند ہوگیا تھا۔ روایات سازی، احادیث کے مجموعے مرتب ہوجانے کے بعد ختم ہوگئی۔ لیکن الہام کا دروازہ قیامت تک کیلئے کھلا ہے۔ بقول محترم شاہ صاحب

"وحی تنزیلی کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں"۔

میں اسوقت اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ کشف وکرامات کی حقیقت کیا ہوتی ہے (کیونکہ بعض لوگوں سے جو خلاف عادات امور صادر ہوتے ہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا)۔ اسلئے کہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔ (میں اس کے متعلق معارف القرآن میں بھی لکھ چکا ہوں اور عند الضرورت بتوفیق الٰہی، اس کے بعد بھی لکھونگا)۔ موضوع زیر نظر کے سلسلہ میں کہنا صرف یہ ہے کہ

"(۱) قرآن کی روسے الہام کی کوئی دینی حیثیت نہیں، نہ جہانتک رسول اللہ کا تعلق ہے، نہ حضورؐ کے بعد۔

(۲) جہاں تک دین کا تعلق ہے، وحی کی صرف ایک ہی قسم ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی تھی اور جس کی آخری صورت قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے بعد کوئی اس وحی سے سرفراز نہیں ہوسکتا۔ جو اس کا مدعی ہو وہ قرآن کے کھلے کھلے الفاظ میں مفتری علی اللہ ہے۔

(۳) قرآن کے ساتھ بصیرت عطا ہوئی ہے۔ اس لئے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی، ان کی تفصیل، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، از روئے بصیرت متعین کی جائے گی۔ یہی رسول اللہ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی اور سنت رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق، معاملات، اور عبادات میں کوئی تفریق وتخصیص نہیں۔ اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادات کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔ (اللہ کے لئے یہ بہت آسان تھا)۔

باب المراسلات

(۱) اسلامی تاریخ

ایک صاحب لکھتے ہیں: "آپ کہتے ہیں کہ تاریخ ظنی چیز ہے اس لئے وہ یقینی طور پر قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسلامی تاریخ تو بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے ماضی کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے مورخین عام ہسٹورینز (Historians) کی طرح نہیں تھے۔ وہ تو بڑے بڑے ائمہ تھے۔ وہ رسول اللہ کے زمانے سے قریب تر تھے۔ اس لئے اس تاریخ کو دوسری تاریخ کے برابر نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگر یہ تاریخ نہ ہو تو ہم صحابہؓ کی سیرت اور کردار کا مطالعہ کہاں سے کریں؟"

طلوع اسلام

تاریخ، تاریخ ہی ہے خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ فرق اتنا ہے کہ آپ کی تاریخ کے ساتھ آپ کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے اور دوسروں کی تاریخ کو آپ صرف تاریخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ورنہ یقینیات کا رتبہ نہ اسے حاصل ہو سکتا ہے نہ اُسے۔ ہمارے مورخین بھی مورخین ہی تھے۔ امام کا لفظ ہمارے ہاں کی ایک علمی اصطلاح تھی۔ اس سے معصومیت اور تقدس مستلزم نہیں ہوتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تاریخ کا مطالعہ خود نہیں کیا ورنہ آپ تفصیلات دریافت کئے بغیر ہم سے متفق ہوتے۔ آپ نے چونکہ سیرتِ صحابہ کبارؓ کا ذکر کیا ہے اس لئے ہم تاریخ سے صحابہ کبارؓ ہی کے متعلق ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ تاریخ ظنی شے ہے یا یقینی۔

امام محمد بن جریر الطبری ہمارے ہاں تفسیر اور تاریخ دونوں کے امام کہلاتے ہیں۔ ان کی تفسیر ام التفاسیر ہے اسی طرح ان کی تاریخ بھی ام التواریخ ہے۔ یعنی تفاسیر میں ان کی تفسیر سب سے پہلی اور اسلامی تاریخ میں ان کی تاریخ اولیت کا سہرا لئے ہوئے[1]۔ یوں کہئے کہ ہمارے ہاں صحابہؓ سے قریب ترین زمانہ کی مفصل تاریخ یہی ہے۔ اس کے بعد کی تاریخیں بیشتر اسی تاریخ پر مبنی ہیں، جیسے بعد کی تفسیریں بالعموم تفسیر طبری ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ یہ ہے تاریخ طبری کی حیثیت۔ اس میں واقعہ بھی وہ لیجئے جو رسول اللہ کی وفات کے بعد سب سے پہلے پیش آیا۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب خلافت کا واقعہ۔ بات مختصراً یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انصار، ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اپنے میں سے حضرت سعدؓ کو خلیفہ منتخب کرنا چاہا۔ اس کے بعد وہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تشریف لے گئے۔ مسئلہ پیش نظر کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوئیں اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ بات اتنی جلدی ختم ہو جانے کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ کسی طرف سے یہ تجویز بھی آئی کہ ایک خلیفہ انصار میں سے ہو جائے اور ایک مہاجرین میں سے۔ چونکہ یہ چیز اتحادِ ملت اور وحدتِ مرکز کے اصول کے خلاف تھی، جو درحقیقت اسلام کا بنیادی نقطہ تھا اس لئے اس امر کا احساس

---

[1] تفسیر اور تاریخ میں، طبری سے پہلے بھی کچھ متفرق چیزیں ملتی ہیں لیکن قرآن کی مکمل تفسیر اور مفصل تاریخ سب سے پہلی طبری ہی کی ہے۔

پیدا ہو گیا کہ مبادا مسئلہ انتخاب ہی ملت میں تفرقے کا موجب نہ بن جائے۔ اس پر سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب اس "معرکۂ انتخاب" کی تفصیل امام طبری کے الفاظ میں سنئے۔ ان کی تاریخ کی جلد اول کے حصۂ چہارم کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

اب ہر طرف سے آ آ کر لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعد کو بچاؤ۔ ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے۔ اس کو قتل کر دو۔ اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑو۔ اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں رہیگا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے بلکہ میں ان کی اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ . . . . چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلے میں اپنا ترکش نہ خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے نہ رنگ لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں۔ اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ . . . . اس کے بعد سے سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک کو ان کے ساتھ ادا نہ کرتے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

یہ ہے تصویر امام طبری کے الفاظ میں ان صحابہ کبارؓ کی جن کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔ یعنی کفار کے مقابلے میں نہایت سخت لیکن آپس میں محبت اور ہمدردی کے پیکر۔ یہ ہیں وہ صحابہؓ جن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ایک کی داڑھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے دانت توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ایک امیدوار خلیفہ بن گئے ہیں لیکن دوسرے امیدوار کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر چلانے کی فکر میں اور اپنی تلوار کو ان کے خون سے رنگین کرنے کی سوچ میں ہیں۔

فرمائیے کہ اس تاریخ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اسے اس لئے صحیح مان لیا جائے کہ اس کے لکھنے والے امام ابن الجریر طبری ہیں اور وہ رسول اللہ سے قریب ترین زمانہ میں ہوئے ہیں[1]؟ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو پھر جو کچھ آپ کے ان بزرگان کرام کے خلاف یورپ کے پادری اور ہندوؤں کے مہاشے لکھتے چلے آ رہے ہیں آپ اس پر چیں بجبیں اور خنجر بدست کیوں ہوتے ہیں! ہمارے نزدیک، عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ اس لئے کہ اس عہد سعادت آگیں کے

---

[1] حالانکہ یہ بھی رسول اللہ سے قریب زمانہ کے نہیں ہیں۔ ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی۔

جو واقعات عبرت و بصیرت کا سامان اپنے اندر رکھتے تھے، قرآن نے انھیں اپنے دامنِ حفاظت میں لے لیا ہے۔ یہی اس دور کی سچی تاریخ ہے، یا باقی تاریخ کا وہ حصہ جو اس (قرآنی) تاریخ سے مطابقت رکھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم تاریخ کو ظنی قرار دیتے ہیں اور صرف قرآن کو یقینی۔ اس نہج سے کتب روایات بھی درحقیقت کتب تاریخ ہی ہیں۔ اور یہ سب اس سازش کی پیدا کردہ یا اس سے متاثر ہیں جو مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے، یا ان کے رسولؐ اور دست پروردگان حضور رسالتمآبؐ کو اُن کے مقام سے گرانے کے لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کے ضمن میں دیکھئے کہ تاریخ کے ساتھ روایات میں کیا ہو رہا تھا۔ طبری کی تاریخ میں صحابہ کبارؓ کی سیرت کا وہ نقشہ ہے جسے آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ انہی صحابہؓ کے متعلق امام بخاریؒ کے مجموعہ روایات میں حسب ذیل "سرٹیفکیٹ" موجود ہے۔ بخاری، کتاب انبیاء میں ہے کہ

> رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو بائیں جانب (جہنم کی طرف) لے جانے کا حکم ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب دیا جائے گا کہ جب آپ ان سے رخصت ہوئے ہیں تو یہ لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔ تو میں وہی کہوں گا جو ایک نیک بندے عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ "میں ان پر اس وقت تک نگراں تھا جب تک میں ان میں موجود تھا۔ . . . . الخ"

یہ ہے صحابۂ رسول اللہؐ کے متعلق بخاری شریف کی شہادت! اب فرمائیے کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی تاریخ اور (قرآن کے بعد) سب سے صحیح کتاب کی ان شہادات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ انھیں صحیح تسلیم کرتے ہیں تو آپ جانیں اور آپ کا دل! لیکن ہم سے تو اس کی توقع نہ رکھئے کہ ہم صحابہ کبارؓ کے متعلق اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لا سکیں خواہ طبرستان اور بخارا کے ہزار امام اس کی شہادت کیوں نہ دیں۔ ان عجمیوں نے جو کچھ اسلام کے ساتھ کیا ہے وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے۔

---

(۲) ملّی تقاریب ایک دوست نے ایک سوال پوچھا ہے جس کا جواب طلوع اسلام کی وساطت سے دے رہا ہوں کیونکہ یہ عام افادی حیثیت رکھتا ہے۔ (پرویز)

استفسار یہ ہے۔ "آپ نے یہ بتایا ہے کہ حج ایک بین الملی اجتماع ہے جس میں نمائندگان ملت اجتماعی امور کے متعلق تدابیر سوچتے ہیں۔ قرآن کریم سے اس کی شہادت ملتی ہے اس لئے یہ امر بڑا موجب اطمینان ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ حج میں جو رسوم ادا کی جاتی ہیں (مثلاً احرام، طواف، سعی، رمی الجمار وغیرہ) ان سے کیا مفہوم ہے؟ یعنی ایک افادی اجتماع کے ساتھ یہ رسومات کیوں؟

جواب آپ نے جو سوال کیا ہے اس کے جواب سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا ایک حصہ جبلت (Instinct) سے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک اور پیاس کی تسکین۔ اس میں نہ جذبات کو دخل ہوتا ہے نہ عقل کو۔ دوسرا حصہ جذبات سے متعلق ہوتا ہے مثلاً نفرت یا پسندیدگی جو محض ذاتی رجحان کی بنا پر ہو۔ اس سے آگے بڑھئے تو عقل و بصیرت کا

مقام آتا ہے۔ اس مقام میں انسان اپنے فائدے اور نقصان کے متعلق سوچتا ہے اور جس کام کو نفع بخش سمجھتا ہے اسے اختیار کرتا ہے یا یوں کہئے کہ عقل کی رو سے انسان اپنے مقصد کے حصول کے ذرائع سوچتا اور اختیار کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جبلت کے تقاضے کے ماتحت انسان کو بھوک لگتی ہے۔ بھوک کیلئے کھانا درکار ہے۔ لیکن انسان چاہتا یہ ہے کہ کھانا لذیذ بھی ہو اور خوش آئند بھی برتن صاف ستھرے ہوں۔ ماحول جاذب نگاہ ہو۔ یہ حصہ ذوق سے تعلق رکھتا ہے جس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے۔ کھانے کی افادی حیثیت تو بھوک کی تسکین یا قوت برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ ذوق کی تسکین بھی کچھ کم حیثیت نہیں رکھتی۔ باقی رہی عقل سو وہ انسان کو ایسی تدابیر سکھاتی ہے جس سے اسے اس قسم کا کھانا اور اس کے متعلقات میسر آجائیں۔ اگر عقل بے زمام ہے تو وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کرلے گی۔ لیکن اگر وہ قوانینِ خداوندی کے تابع ہے تو وہ صرف ایسی تدابیر اختیار کریگی جنھیں یہ قانون جائز قرار دے۔ جائز تدابیر کی رو سے جو کچھ حاصل کیا جائے گا اس میں انسان کے جبلی تقاضے (بھوک) کی تسکین کا سامان بھی ہوگا اور اس کے جذبات (لذتِ نگہ و کام و دہن) کی تسکین کا بھی۔ عقل بھی اس سے مطمئن ہو جائے گی اور شرفِ انسانیت کی برومندی کا سامان بھی پیدا ہو جائے گا۔

اس مثال میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ افادی پہلو اور جذباتی پہلو دونوں سامنے آجاتے ہیں۔ "دنیائے مذہب" میں سمجھا یہ جاتا تھا کہ افادی پہلو یکسر دنیا داری ہے۔ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ باقی رہے جذبات۔ سو ان میں سے جن جذبات کو مذہب نے "سفلی" قرار دیدیا ان کا فنا کر دینا مذہب کی غائت قرار پا گیا۔ یہ حصہ مذہب کا منفی پہلو تھا۔ مثبت پہلو یہ تھا کہ جن جذبات کو "علوی" سمجھا گیا ان کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اس کے لئے پوجا پاٹ اور گیان دھیان کو ذریعہ قرار دیا گیا۔

قرآن نے آکر بتایا کہ افادی اور جذباتی، دونوں پہلو یکساں ضروری اور شرف انسانیت کی برومندی کے لئے لاینفک ہیں، بس اس شرط کے ساتھ کہ انھیں قانونِ خداوندی کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا جائے اور ان کے حصول کے لئے کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہ کیا جائے جسے اس قانون نے جائز نہ قرار دیا ہو۔ اس نے کہا کہ جذبات کی "سفلی" اور "علوی" تقسیم حد درجہ بے خبراں ہے۔ سب جذبات وجہ بالیدگی آدمیت ہیں بشرطیکہ ان میں توازن رکھا جائے اور وہ "حدود اللہ" سے نہ ٹکرائیں۔

جذبات، غیر محسوس اور غیر مرئی کیفیات کا نام ہیں۔ لیکن انسان ہمیشہ اپنی جذباتی کیفیات کے اظہار میں لذت و تسکین محسوس کرتا ہے۔ اظہارِ کیفیات محسوس و مرئی پیکروں کا مقتضی ہوتا ہے۔ الفاظ اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں لیکن بہت سے مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں چہرے کے تغیرات یا جسمانی حرکات و سکنات، الفاظ سے بھی واضح تر انداز میں اظہارِ جذبات کر دیتے ہیں۔ پیشانی کی شکن، نگاہ کا انداز، رخسار کی رنگت، لبوں کا ارتعاش، سر کی جنبش، جسم کی تھرتھراہٹ، پاؤں کی حرکت، بعض اوقات وہ کچھ کہہ جاتی ہے جو ہزار مرصع غزلوں سے بھی بن نہیں پڑتا۔

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت، نیست سوگندے دگر

نگاہوں اور تبسموں، جنبشوں اور ارتعاشوں کا یہ خاموش اسلوبِ بیان ہزار نامہ و پیام سے زیادہ اثر انگیز اور لاکھ عرض و التماس سے بڑھ کر دلدوز ہوتا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی (مرحوم) کے الفاظ میں،

ہے ہے میری چشمِ حیرت کا، سب حالِ دل ان سے کہہ جانا
کچھ سوچ کے ان کا دانتوں میں ہونٹوں کو دبا کر رہ جانا

یہ اظہارِ جذبات کا انفرادی پہلو ہے۔ جب یہی چیز اجتماعی یا قومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اسے "رسومات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسومات کیا ہیں؟ کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کی راہیں اور بلی تاثرات کے انکشاف کے ذرائع۔ قرآن، اظہارِ جذبات کے ان مرئی اور محسوس پیکروں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ نظامِ صلوٰۃ کے محسوس عنصر (نماز) میں قیام و رکوع و سجود، تسلیم و اطاعت کے جذبات اور ہم آہنگی و یکرنگی کے تاثرات ہی کے مرئی پیکر ہیں۔ یہ پیرایۂ اظہارِ جذبات، حج کی تقریب میں اور بھی مشہود ہو جاتا ہے۔ حج، ملتِ اسلامیہ کے اس عزم کا مظہر اور اس نصب العین کے حصول کی تدبیر کا ذریعہ ہے کہ جس طرح تمام عالمِ آفاق میں ایک ہی قانون جاری و ساری ہے اسی طرح تمام عالمِ انسانیت میں بھی ایک ہی قانون (یعنی قانونِ خداوندی) کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ ملتِ اسلامیہ اس نظریۂ توحید کی علمبردار ہے اور کعبہ ان کا مرکزِ محسوس ہے۔ لہٰذا کعبہ، اس مجرد حقیقت کا مرئی نشان (Symbol) ہے۔ اسی اعتبار سے کعبہ اور اس کے متعلقات کو شعائر اللہ (نشاناتِ خداوندی یا Symbols) کہا گیا ہے۔ ان شعائر کی تعظیم، جذباتِ توحید کا مرئی مظاہرہ ہے۔ تعظیم، کعبہ کے اینٹ اور پتھر کی نہیں۔ اینٹ اور پتھر تو کعبہ کی عمارت میں کئی بار لگائے گئے اور کئی بار بدلے۔ بعض اوقات وہ برباد بھی ہو گئے۔ لیکن وہ نشان جو ملتِ حنیفہ کے مؤسسِ اول کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جذباتِ توحید کے مظہر کی حیثیت سے آج تک قائم ہے۔

حج کی حیثیت تو افادی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جذباتی پہلو کی رعایت کے پیشِ نظر ان مراسم (مناسک) کو قائم رکھا گیا ہے جو اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ان مراسم میں احرام اور طواف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ احرام (دو بن سلی چادروں کا لباس) وحدتِ ملت و مساواتِ آدمیت کا محسوس مظہر ہے اور دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کے عزم کا اسلوبِ اظہار۔ اسی لئے حالتِ احرام میں شکار تک کی بھی اجازت نہیں۔ باقی رہا طوافِ کعبہ، تو یہ اس عہد و پیمان کے اقرار کا ذریعہ اظہار ہے کہ ہماری سعی و عمل کی تمام گردشیں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1] کی بلند حقیقت اسی نصب العین کی ترجمان ہے۔ یعنی اس امر کا اقرار کہ ہماری ہستی قانونِ خداوندی کے بقاء و استحکام کے لئے ہے اور ہماری زندگی کی تمام گردشیں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں۔ طائف رات کے چوکیدار کو کہتے ہیں اور طواف نہایت عمدہ خدمت گار کو، طوف ان بیلوں کو کہتے ہیں جو کھلیانوں پر گھومتے ہیں تاکہ ان سے غلہ برآمد ہو جائے۔ نیز یہ اس مشکیزے کو بھی کہتے ہیں جس کے ذریعے دریا پار کیا جائے۔ طواف کے ان معانی پر غور کیجئے اور

---

[1] وہی انا للہ وانا الیہ راجعون جس کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ موت کی خبر سن کر اسے دہرا دیا جائے۔ اتنی عظیم الشان حقیقت کس طرح (معاذ اللہ) منحوس سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ جیسے سورۂ یٰسین۔

پھر سوچئے کہ یہ "رسم" کتنی بڑی مجرد حقیقت کے اظہار کا محسوس انداز ہے۔ اس مرکز توحید کے گرد جمع ہونے سے انسانی قلوب جن والہانہ جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں، قرآن نے ان کے اظہار کے لئے کعبہ کے طواف کی "رسم" کو قائم رکھا۔ وفور جذبات کے بہاؤ کیلئے اگر اس قسم کا راستہ نہ نکالا جاتا تو نفسیاتی طور پر اس کے اثرات بہت دور رس ہو جاتے۔

پری رو تاب مستوری ندارند چو در بندی ز روزن سر برآرند

جہاں تک "رسوم" کا تعلق ہے قرآن میں انہی دو کا ذکر صراحتاً آیا ہے (باقی رہا عرفات کا اجتماع اور منیٰ کا قیام وغیرہ تو وہ سب اس اجتماعی مقصد کیلئے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے)۔ جہاں تک سعی بین الصفا والمروہ کا تعلق ہے قرآن میں ہے:۔

ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما... (۲/۱۵۸)

یقیناً صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ سو جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں میں طواف کرے۔

صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں جن کی وادی میں کعبہ واقع ہے۔ اس آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ اس بات میں کچھ حرج نہیں کہ ان کا "طواف" کیا جائے۔ طواف کے معنی گھومنا پھرنا بھی ہے۔ سو یا تو اس سے یہ مفہوم ہے کہ ان کے شعائر اللہ ہونے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ پہاڑیاں ایسی مقدس ہیں کہ ان میں چلنے پھرنے کی ممانعت ہے۔ شعائر اللہ بن جانے سے ان پہاڑیوں اور ان کی درمیانی وادی میں چلنے پھرنے سے گناہ نہیں ہوتا۔ ان میں چلنے پھرنے کی اجازت ہے۔

یا اس سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کعبہ ہی کے تضمنات میں سے ہے اس لئے ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بہرکیف اس طواف کا حکم نہیں۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں (لا جناح علیہ)۔ اسی اعتبار سے یہ مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے کہ ان میں چلنے پھرنے سے کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی عام پہاڑیوں کی طرح پہاڑیاں ہیں۔ فقط اتنی بات ہے کہ خانہ کعبہ اور اس سے متعلقہ وادی سب شعائر اللہ (خدا کی توحید کے اعلان کے نشانات) ہیں اس لئے ان کی تعظیم صرف ان کے شعائر اللہ سمجھنے تک ہے۔ ان کے پتھر اور مٹی کسی تعظیم کے مستحق نہیں کہ تم انھیں مقدس سمجھ کر ان میں چلنا پھرنا ہی چھوڑ دو۔

ان کے علاوہ، قرآن میں حج کی کسی اور "رسم" کا ذکر نہیں نہ حجر اسود کا۔ نہ کنکریاں مارنے کا۔ جہاں تک شعائر اللہ کی تعظیم کا تعلق ہے، قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا کہیں ان کی پرستش نہ شروع کر دینا۔ دیکھئے۔ سورۂ حج میں جہاں شعائر اللہ کی حرمت و تعظیم کا ذکر ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ یہ سب کچھ "حنفاء للہ غیر مشرکین" کرنا ہوگا۔ یعنی ہر طرف سے خیالات ہٹا کر صرف ایک اللہ کو سامنے رکھ کر۔ اس لئے کہ

ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے تو اس کی مثال یوں سمجھو جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں آگرا۔ یا جیسے کسی چھوٹے سے پرندے کو عقاب یا شہباز اُچک کر لے جائے یا آندھی کا جھکڑ کسی کو اٹھا کر اس کے مقام سے دور پھینک دے۔

اور اس کے بعد اس حقیقت کی وضاحت فرما دی کہ شعائر اللہ کی تعظیم سے مقصود کیا ہے۔ فرمایا:۔

ذالك من يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب - (۲۲/۳۲)

بات یہ ہے کہ جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے اسے سمجھ رکھنا چاہئے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے جذبات (قلب) قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رہیں۔

اگر خالی قانون کی اطاعت کرائی جائے تو یہ اطاعت کرنا میکانکی طور پر (Mechanical action) ہو جاتا ہے جس میں زندگی کے نرم و نازک گوشوں کی رعایت نہیں ہوتی۔ اگر محض جذبات کی تسکین پیش نظر رہے تو اس سے زندگی کے حقائق نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قانون کو جذبات کے ساتھ سمو دیا جائے یعنی زندگی کی گاڑی میں پٹرول اور موبل آئل دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوں تاکہ اس کی رفتار بھی قائم رہے اور حرکت کی حدت یا (Friction) سے پرزے بھی نہ جلنے پائیں۔ یہ ہے جذبات کے سرچشمے (یعنی قلب کو) قانون کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا (تقوی القلوب)۔ یہی ہے شعائر اللہ کی تعظیم سے مقصود۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے حج جیسے یکسر افادی اجتماع کے ساتھ دو چار رسوم کا قائم رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ حج کا اجتماع حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلا آرہا تھا لیکن رسول اللہ کی بعثت کے وقت، اس کی افادی حیثیت نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور صرف رسومات باقی رہ گئی تھیں۔ قرآن اس کی افادی حیثیت کو پھر سامنے لے آیا جب فرمایا کہ کعبہ، قیامِ انسانیت کا موجب (قیاماً للناس) ہے اور اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اجتماعی منافع اپنے سامنے موجود دیکھ لو (لیشھدوا منافع لھم)۔ اور اس کے ساتھ ہی ان رسوم کو بھی قائم رکھا جو جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھیں البتہ انھیں ان عناصر سے پاک کر دیا جو شرک اور توہم پرستی کی طرف منجر ہو سکتے تھے۔ یہ تھا قرآنی حج جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہ میں رائج تھا۔ اس کے بعد اسلام پر جاہلیت چھا گئی جس سے حج کی افادی حیثیت پھر نظروں سے غائب ہو گئی اور فقط رسومات باقی رہ گئیں۔ یہ ہے وہ حج جو اسوقت رائج ہے۔ اس سے جذبات کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن افادی حیثیت بالکل غائب ہے۔ جس حاجی سے پوچھئے وہ کہدے گا کہ سبحان اللہ! حریم کعبہ میں پہنچکر انسان پر ایسی کیفیت "طاری ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو محض جذبات کی تسکین ہے۔ اس میں اجتماعی مفاد کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ "رسم" ہے، اسلامی معاشرہ کا جزو نہیں۔ یہ زندگی کی گاڑی میں موبل آئل ہے، پٹرول نہیں کہ جس سے گاڑی چل سکے۔ تنہا موبل آئل لاکھوں من بھی جمع کر لیجئے، گاڑی اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔ بلکہ اس سے اس کے پرزوں میں اُلٹی چکٹ جم جائے گی۔ اسلامی نظام زندگی میں یہ تبدیلی اس دن سے ہو گئی جب دین، مذہب سے بدل گیا۔ اب ہماری صلوٰۃ وہی ہے جو مذہب میں پوجا پاٹ یا ایشور بھگتی کہلاتی ہے۔ ہمارے روزے وہی ہیں جنھیں مذہب میں برت کہتے ہیں۔ ہماری زکوٰۃ وہی شے ہے جسے مذہب دان یا خیرات کہہ کر پکارتا ہے۔ ہمارا حج، مذہب کی یاترا ہے۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ مذہب کے ہاں اسی کو پُن کہتے ہیں۔ اور ثواب سے نجات (مکتی یا Salvation) ملتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح دین (نظام زندگی) یکسر مذہب بن کر رہ گیا۔ اب یہ تمام "عبادات" اس لئے سرانجام دی جاتی ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ ان امور کو نہ افادیت سے کچھ تعلق ہے نہ عقل و بصیرت سے کچھ واسطہ۔ آج ہم بھی اسی مقام پر ہیں جہاں اسلام سے پہلے دنیا تھی یعنی مذہب کی سطح پر جہاں سے ہمیں دین نے ابھارا تھا۔

لہٰذا اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ دین میں جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے لیکن دین کا مقصود محض جذبات کی تسکین نہیں۔ دین کے جن احکام سے ہماری دنیا نہیں سنورتی وہ درحقیقت دین کے احکام نہیں ہوسکتے وہ فقط مذہب کی طمع کاری ہے اور جب تک ہماری دنیا نہیں سنورتی اس وقت تک عاقبت بھی نہیں سنور سکتی کہ من کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

لیکن ہمارے ہاں تو رسومات تک بھی میکانکی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی کہیں دل کی کشادا اور جذبات کی شگفتگی کو دخل نہ رہا۔ ہمارے ملی ارکان و شعائر میں نہ افادیت باقی رہی ہے نہ صحیح جذبات کی تسکین کا سامان! زندہ قوموں کے تیوہاروں کو دیکھئے؟ ان میں کس قدر تازگی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ قوم کا ہر فرد، بچہ، بوڑھا، جوان، مرد، عورت، غریب، امیر، ہر ایک پورے جذبات و انہماک اور کامل ذوق و شوق سے اس تیوہار کی نزہت و بشاشت اور کشش و جاذبیت کو تیز سے تیز تر کرنے میں مستانہ وار شریک ہو رہا ہے۔ ہمارا مطلب ان لغویات و خرافات سے نہیں جو اکثر قوموں کے تیوہاروں کا جزو بن کر رہ گئے ہیں بلکہ دل کے انبساط اور روح کی شگفتگی سے ہے جس سے ان تیوہاروں میں حصہ لیا جاتا ہے۔ ایسی تقاریب پر مسرتوں کے چشمے قلب کی گہرائیوں سے ابلتے دکھائی دیں گے۔ غریب اور امیر کا فرق مٹ جائے گا۔ طبقاتی تقسیم کا احساس محو ہو جائے گا اور اس طرح ہر فرد اپنے آپ کو قوم کا لاینفک حصہ تصور کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ لیکن ہمارے ہاں ان ملی تقاریب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی عید کی تقریب کا تصور سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ صبح سے شام تک آپ کے دل کا کسقدر حصہ اس میں شامل تھا اور کس حد تک آپ اس میں محض "رسمی طور پر" (Conventionally) طوعاً و کرہاً شریک ہو رہے تھے۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی ہر حرکت مشینی طور پر عمل میں آ رہی تھی۔ نہ اس تقریب کے اجتماع میں آپ کی شرکت آپ کے دل کی کشش سے تھی نہ انفرادی طور پر آپ کے سینے میں مسرتوں کا کوئی چشمہ ابلا تھا، نہ احباب کی ملاقات کے لئے آپ کا آغوش جوش انبساط سے وا ہوا تھا۔ نہ خود اس تقریب کی اہمیت نے آپ کے قلب کو گرمایا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حسرت انگیز وہ منظر تھا جو (دورِ حاضرہ کی ایجاد) تشریفاتِ عید (Eid Receptions) میں دیکھنے میں آیا تھا۔ وہاں امیر اور غریب کی جگر سوز تفریق اور طبقاتی تقسیم کی ذلت آمیز تمیز نمایاں طور پر سامنے آ رہی تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس ملنے سے بچھڑنا ہزار درجے اچھا اور اس اجتماع سے انتشار لاکھ درجے بہتر۔ وہاں ہر ہنسی منافقت کی غماز اور ہر دزدیدہ نگاہ منافرت کی آئینہ دار تھی۔ وہاں ہر مصافحہ اپنے سے نچلے درجے کے انسان کو دور دھکیلنے کا ذریعہ اور ہر معانقہ اس سے پیچھے ہٹنے کا بہانہ تھا۔

آپ نے دیکھا ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی ہماری حالت کیا ہو چکی ہے۔ ہم وہ ہیں کہ نہ جن کے پاس دین رہا ہے نہ دنیا۔ نہ افادیت رہی نہ جذبات۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

---

(۳) قرآن فہمی کا طریق

محترم عرشی صاحب کا مکتوب گرامی:-

"سلیم کے نام" خط (جون ۱۹۵۱ء) میں نے آج دوبارہ پڑھا، دراصل ان خطوط میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد پڑ رہی ہے، قرآن کو سمجھنے کے نئے راستے کھل رہے ہیں، جو بظاہر نئے ہیں اور حقیقتاً پرانے۔ یعنی این و آن سے صرفِ نظر کرکے صرف قرآن کو سامنے رکھنا، جیسا کہ قرنِ اول میں تھا۔ اس تازہ خط میں کئی باتیں ہیں جن پر مفصل اظہارِ رائے کی ضرورت ہے سرِدست صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ کے قلم سے شاید روح القدس نے یہ فقرے لکھوا دیئے ہیں:-

> ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے، قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق، قرآن کا مفہوم از سرِ نو متعین کریں۔

آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ فقہا و محدثین کی بے شمار اصطلاحات نے ہم کو اس قرآن سے بہت دور پھینک دیا ہے جو قدیم مخاطبین قرآن نے سمجھا اور سمجھتے ہی پیتل سے سونا اور کانچ سے الماس بن گئے، یعنی ابھی ابھی وہ لٹیرے، وحشی، لڑاکے، فاسق فاجر، جواری، شرابی اور نہ جانے کیا کیا تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے اور اس کے دوبارہ اٹھتے ہی وہی خونخوار چہرے مقدس و نورانی بن جاتے ہیں۔ اب ان کی ہر ادا میں دل نوازی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ان کے سامنے سو پچاس بڑے بڑے فقیہ و محدث اور قرآن کی بجائے صحاحِ ستہ و شرح وقایہ وغیرہ پیش کی جاتیں تو یقیناً یہ نتیجہ نہ نکلتا جو تاریخ کے آسمان پر ستاروں سے زیادہ روشن نظر آرہا ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کو انہی معنوں میں سمجھا جائے جن میں صحابہؓ نے سمجھا تھا۔ اور یہ نکتہ بھی آپ نے خوب کہا کہ

"اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق"

یہ بات نہایت اہم بھی ہے اور ہمارے موجودہ مریضانہ حالات میں نہایت مشکل بھی۔ وہ ذہن جو صدیوں سے اصطلاحی مفہوموں سے متاثر بلکہ ماؤف ہو چکے ہیں، اس وقت منڈی میں انہی کی درآمد برآمد ہو رہی ہے، ان سے یہ توقع رکھنا کہ "اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں" قطعاً ناممکن ہے۔ لے دے کر ایک طلوعِ اسلام ہے اور اس کے دو ایک لکھنے والے۔ جن کا بحالاتِ موجودہ اس امرِ عظیم سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار نظر آتا ہے۔ (لیکن اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی بعید نہیں)۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ "فطرت" کے مروجہ معانی کی تردید میں آپ نے معقول قدم اٹھایا ہے اور جو معنی اپنی طرف سے پیش کئے ہیں وہ قرآن مجید کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طریق پر سارے قرآن کے نہ سہی خاص خاص الفاظ کے معانی تلاش کرتے جائیں تو آئندہ کیلئے راستہ تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ کام کسی تنہا دماغ کے بس کی بات نہیں۔ مفکرین کی ایک جماعت ہو جو قرآن کے اندر غوطے لگا لگا کر ان موتیوں کو برآمد کرے۔

میں نے محترم عرشی صاحب کا یہ خط اس لئے شائع کیا ہے کہ اس میں انھوں نے جس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ فی الواقعہ بڑی اہم ہے اور اس قابل کہ ملک کا سوچنے والا طبقہ اس پر غور و فکر کرے۔

میں عمر بھر ان اسباب و علل پر غور کرتا رہا جن کی وجہ سے مسلمان اس سرچشمہ حیات (یعنی قرآن کریم) سے دور ہوتے چلے گئے جس نے انھیں ایک زمانہ میں زندگی اور اس کی تمام سعادتوں سے نوازا تھا۔ مجھے منجملہ دیگر اسباب، ایک سبب یہ بھی نظر آیا (اور یہ سبب بڑا بنیادی تھا) کہ ہمارے ہاں قرآن کے الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ بیشتر غیر قرآنی ہے۔ اس کیلئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم چونکہ قرآن کو ترجموں کے ذریعے سمجھتے ہیں اس لئے اس کی اصل سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن سمجھنے کیلئے عربی جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور جب تک ہم عربی نہ جانیں قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ لیکن اس سے اس مشکل کا حل نہیں ہوتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ جن حضرات نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں، وہ تو عربی جانتے تھے۔ اگر عربی جاننے سے صحیح قرآن سمجھ میں آجاتا تو ان کے ترجموں سے بھی قرآن سمجھ میں آجانا چاہئے تھا۔ تمام تر نہیں تو کم از کم قریب قریب۔ دوسری چیز یہ (اور یہ پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے) کہ آج مسلمانانِ عالم کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس کی مادری زبان عربی ہے۔ ان کیلئے صحیح قرآن سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی قریب قریب اسی قسم کا قرآن سمجھتے ہیں جس قسم کا قرآن ہمارے ہاں ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ آپ عربی ممالک (یعنی عربی بولنے والے مصنفین) کی مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھئے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے ان میں اور اپنے ہاں کی مذہبی کتابوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ مجھے ایک عرب ادیب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ادب کا امام۔ زبان پر اسقدر عبور کہ ایک ایک لفظ کی بیسیوں سندات مستحضر۔ ایسا نظر آتا تھا کہ بڑے بڑے عربی لغت، شعراء کے دواوین اور کتب محاضرات سے حفظ یاد ہیں۔ مرادفات کے معانی میں ایسا لطیف فرق بتاتا تھا کہ سُنکر لطف آجاتا تھا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ جونہی قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی، وہ وہی مفہوم بیان کرتا جو ہمارے مکتبوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اور جس میں قرآن کہیں نام کو نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں بھی قرآن کو انہی تفاسیر کے ذریعے سمجھا جاتا ہے جو عجم زدہ ذہنیتوں کی پیداوار ہیں اور اس ماحول کی تخلیق جس میں مسلمان قرآن سے دور ہو چکا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے اور عرب ہو یا غیر عرب، ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے۔ لہٰذا قرآن سے بعد کا اصلی سبب عربی نہ جاننا نہیں۔ اس کا سبب وہ مصطلحہ مفہوم ہے جو ہمارے ہاں ایک مدت سے رائج چلا آرہا ہے اور جو مفہوم عجمی ہے، قرآنی نہیں۔ ہم قرآنی الفاظ کے معانی انہی اصطلاحات کی رو سے سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہماری عربی وہ عربی ہی نہیں رہی جو زمانۂ نزولِ قرآن میں تھی۔ اس کے الفاظ تو بیشک وہی ہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم عجمی تصورات کا پیدا کردہ ہے اور یہی مفہوم عرب اور عجم ہر جگہ رائج ہے۔ اس لئے قرآن کا صحیح مفہوم نہ عربی جاننے والے سمجھتے ہیں نہ وہ جو عربی نہیں جانتے اور قرآن کو ترجموں سے سمجھتے ہیں۔

جب قرآن نازل ہوا تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا جو بعد میں فقہ، روایات، تصوف، کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہوئیں اور آہستہ آہستہ دین کا جزو بنتی گئیں۔ اگر ان اصطلاحات سے مقصود وقتی مسائل کا حل ہوتا (اور ان کا دائرۂ عمل وہیں تک محدود رہتا)

تو اس میں کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن مصیبت یہ ہوگئی کہ ان چیزوں کو دین کا مستقل اور غیر متبدل جزو سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود قرآن بھی انہی کی روشنی میں سمجھا جانے لگا اور رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ قرآن متن اور اصل رہتا اور یہ چیزیں اس کی شرح اور جزئیات سمجھی جاتیں یہ چیزیں اصل اور متن بن گئیں اور قرآن ان کا شارح ہو کر رہ گیا۔ اب قرآن کا سارا مفہوم انہی (بعد کے پیدا شدہ) تصورات کی تشریح ہے اور قرآن کا یہی مفہوم ہر جگہ پڑھایا اور سمجھایا جاتا ہے، خواہ عرب ہو یا عجم۔

قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے۔ یعنی اسی واضح اور سادہ زبان میں جو اُس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی۔ اُس زمانہ کے عربوں کی معاشرت بالکل سادہ تھی وہ عجم کے تکلفات اور حضارت کے اثرات سے غیر متاثر تھے۔ صحرا کی کھلی فضا، کھجوروں کے خوشے متاعِ حیات۔ چند پالتو مویشی۔ ایک آدھ خیمہ۔ دن میں کوئی نخلستان منزل گاہ۔ راتوں کو ستارے دلیلِ راہ۔ یہی چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور انہی کے گرد ان کی زبان کے مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ آپ ان مشتقات کو دیکھئے۔ ان کا بیشتر حصہ، اونٹ۔ گھوڑے، بکریاں، خیمے، نخلستان، کھجوریں، تلوار، صحرا، چاند، سورج، ستاروں کے محسوس مشاہدات پر مبنی ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان میں وسعت بھی ایسی تھی کہ انہی مشتقات سے نکلے ہوئے الفاظ ایک دنیا کو محیط ہو جاتے تھے۔ اس زبان کی امکانی وسعتوں کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ مشہور معتزلی امام، واصل بن عطاء، حرف را (ر) کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ خطابت اس زمانے میں، سب سے بڑا ہتھیار تھا اور اس کی سحر کاریاں فصاحت اور بلاغت کی رہینِ کرم تھیں۔ ایک نئے فرقے کے امام کی حیثیت سے واصل کو عمر بھر تقریریں کرنی پڑیں۔ مناظروں اور مباحثوں میں سرگرم تکلم رہنا پڑا۔ لیکن اس نے کہیں کسی جگہ، کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس میں (ر) آتا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ اس کے پاس کس قدر مرادفات کا ذخیرہ تھا۔ اور پھر غور فرمائیے کہ وہ زبان جس کے الفاظ کے سرمایہ کا یہ عالم تھا کس قدر وسعت داماں تھی!

بہرحال جب قرآن نازل ہوا تو اس کے اولین مخاطبین نے اسے بغیر کسی دقت کے سمجھ لیا۔ اس کے لئے نہ انہیں کسی تفسیر کی ضرورت پڑی اور نہ اُن اٹھارہ علوم کی جنہیں اب قرآن سمجھنے کی لازمی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ الفاظ جن میں قرآن نازل ہوا تھا ان کی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتے تھے اس لئے وہ جانتے تھے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ تغیرِ احوال و کوائف سے زبان پر کیا کیا اثرات پڑتے ہیں، اس سے علم اللسان کا ہر طالب علم واقف ہے۔ عربی زبان ان تغیرات سے خاص طور پر متاثر ہوئی، اس لئے کہ ہمارا علمی دور بالخصوص عباسیوں کا زمانہ تھا جب عربی ذہنیت سمٹ کر پیچھے ہٹ چکی تھی اور عجمی اثرات پورے کے پورے اسلامی معاشرے پر چھا چکے تھے۔ ان عجمیوں نے زبان تو عربی اختیار کی لیکن تصورات اپنے ہی رکھے۔ اس طرح عربی زبان عجمی تصورات کے اظہار کا ذریعہ (Vehicle) بن گئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں ہماری تصنیفات کا آغاز ہوا۔ لہٰذا ہماری ان کتابوں کی زبان تو عربی تھی لیکن ان عربی الفاظ کا مفہوم وہ نہ تھا جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں کے ذہنوں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو پھر بھی بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب غیر عربوں سے خلاملا کی ابتدا ہوئی تو آپؓ مدینہ کے رہنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ قرآن

سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر چند دن گذارا کرو کیونکہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں غیر متاثر شکل میں باقی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جس عربی زبان میں ہمارے عجمی ائمہ مذہب نے کتب تفاسیر وغیرہ لکھی ہیں وہ زبان معنوی اعتبار سے قرآن کی زبان سے کس قدر قریب ہو سکتی ہے؟ یہی وہ زبان ہے جس میں ہمیں قرآن سمجھایا جاتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ سمجھایا جاتا ہے وہ یہ درحقیقت قرآن نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے جسے قرآنی الفاظ میں سمو دیا گیا۔

اندریں حالات، قرآن سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس بعد کے مفہوم سے صرفِ نظر کر کے دیکھا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت ان الفاظ کے معانی کیا تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ہاں اتنا ذخیرہ موجود ہے جس سے ان الفاظ کے وہ معانی متعین کئے جا سکتے ہیں جو اُس زمانے کے سیدھے سادے عربوں کے ہاں رائج تھے۔ یہ ذخیرہ مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے لیکن اسے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ فلہٰذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ ایک ایسی لغت مرتب کر دی جائے جس میں یہ بتایا جائے کہ قرآن کے الفاظ کے اصلی مادے کیا ہیں اور زمانۂ نزولِ قرآن میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے۔ (اگر ہو سکے تو یہ بھی بتا دیا جائے کہ بعد میں ان الفاظ کے معانی میں کیا کیا تغیرات واقعہ ہوئے لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جا سکے تو چنداں مضائقہ نہیں)۔ میری نگاہ سے قرآن کا کوئی لغت ایسا نہیں گذرا جس میں خصوصیت سے اس انداز سے قرآنی مفردات کے معانی متعین کئے گئے ہوں۔ متاخرین میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس ضمن میں کوشش شروع کی تھی لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس عظیم کام کو چھو کر رہ گئے۔ انھیں عہد جاہلیہ کی زبان پر اتنا عبور اور قرآن کے ساتھ ایسا شغف تھا کہ وہ اگر کچھ مدت اور زندہ رہتے تو اس باب میں مفید کام کر جاتے۔

اس لغت کے مرتب کر لینے کے بعد دوسرا مرحلہ قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہمارے دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھانا ہوگا۔ اس کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ ہر لفظ کی اس روح کو سامنے رکھا جائے جو اس کی اصل کی رو سے بے نقاب ہوئی ہے اور پھر دیکھا جائے کہ اس روح کو موجودہ زمانے کے کن الفاظ میں ٹھیک ٹھیک ادا کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ایک لفظ میں، خواہ ایک فقرہ میں اور خواہ ایک مضمون میں۔ اس کے بعد دیکھ لیا جائے کہ قرآن میں وہ لفظ کس کس جگہ استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن تصریف آیات سے اپنے معانی آپ سمجھاتا ہے۔ اس طرح قرآن کا صحیح صحیح مفہوم ہمارے سامنے آجائے گا۔ میں نے اس طریق پر خود عمل کیا ہے اور اس کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آئے ہیں جن سے روح وجد کرنے لگ جاتی ہے اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اگر قرآنی الفاظ کی اصل کو سامنے رکھ لیا جائے تو پھر قرآن کس طرح اپنے مشکل سے مشکل مقامات کو بھی نہایت آسانی سے سمجھاتا چلا جاتا ہے۔

یہ لغت اگر ایک مرتبہ صحیح طور پر مرتب ہو گیا تو ہمیشہ کیلئے کام آئے گا لیکن قرآن کا جو مفہوم اس لغت کی روشنی میں متعین کیا جائے گا وہ ہر آنے والے زمانے کی علمی سطح کے ساتھ ساتھ (Improve) ہوتا جائے گا۔

میں محترم عرشی صاحب سے حرف بہ حرف متفق ہوں کہ یہ کام کسی فرد کا نہیں، جماعت کے کرنے کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت

ہے کہاں جو اس کام کو ہاتھ میں لے؟ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں لیکن اس میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا مصرف صرف اس کے الفاظ کی تلاوت ہے جس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ قرآن سے باہر ہے۔ لہٰذا مذہب کے نام پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ ان چیزوں کے لئے وقف ہوتا ہے جو خارج از قرآن ہیں۔ اگر کہیں سے رجعت الی القرآن کی آواز اٹھتی ہے تو مسلمانوں کو اس آواز سے اس طرح ڈرا دیا جاتا ہے گویا اس آواز کے کان میں پڑ جانے سے ان کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ یہ اس لئے کہ اگر مسلمان قرآن کی طرف آجائیں تو اس سے پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اندریں حالات وسائل کہاں سے میسر آئیں جو اس قسم کا قرآنی لٹریچر مرتب کرنے کیلئے ضروری ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کام کے اہل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جب اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دینگے تو ان کی ضروریاتِ زندگی کا سامان کہاں سے آئیگا؟ یہ انگلستان بھی نہیں کہ ایک لارڈ نارتھمبرلینڈ عربی کا لغت مرتب کرانے کیلئے اپنی ریاست وقف کر دے گا۔[1]

ان حالات کے پیشِ نظر یہاں قرآن کے متعلق کسی کام کا ارادہ کرنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ انھیں جو کچھ کرنا ہوگا تنہا اپنے بھروسے پر کرنا ہوگا۔ جس نہج پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ کے ذہن کا رہینِ منت ہے۔ میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ملک کے ارباب علم وقلم کو بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہیں تو وہ ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے کتاب کے خاکے کی بہت تعریف کی لیکن ہر ایک نے یہ لکھکر معذرت چاہی کہ ایسا کام فرد کا نہیں، جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کیلئے کوئی آدمی تیار نہیں ہوتا۔ انھوں نے اسی خط کے حاشیے پر یہ لکھکر خط واپس کر دیا کہ اگر کچھ وقت کیلئے تم ہی آدمی بن جاؤ تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلوپیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کرینگے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھی جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ تم مسافت کی لمبائی اور راستے کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جبتک تم اس دیئے کو لیکر ایک جگہ کھڑے ہو۔ تم اسے لیکر چل پڑو اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سا دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے چلا جاتا ہے۔ نقص دیئے کا نہیں، تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے، یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہوگی اور جہاں تک چلتے جاؤ گے آگے آگے ہی رہے گی۔

میں نے بلا مزید استفسار وتامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لیکر چلنا شروع کر دیا اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقعہ میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا۔ معارف القرآن کی چار جلدیں (بتوفیق خداوندی) شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں زیرِ ترتیب ہے۔ میں جب اپنی قطع کردہ راہ پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ ساری مسافت میں نے ہی طے کی ہے؟ اگر اللہ نے مجھے اس سلسلہ کی تکمیل کی مہلت اور توفیق عطا کر دی تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری گوناگوں مصروفیات اور خرابیٔ صحت کے

---

[1] اس لارڈ نے تنہا اپنے خرچ سے (Lane's Lexicon) مرتب کرایا تھا جس کی تکمیل میں بیس برس صرف ہوئے تھے۔

پیشِ نظر میرے لئے معارف القرآن کی تکمیل کا کام ہی کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ قرآن کا ایک ایسا لغت مرتب کرنا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور اس کے مطابق قرآنی مفہوم کا متعین کرنا، بھی از بس ضروری ہے۔ اگر یہ ہو گیا تو جو موانع اس وقت قرآن سمجھنے کی راہ میں سنگ گراں بنکر حائل ہیں وہ سب . . . . دور ہو جائیں گے۔ اور اس طرح مسلمان ایک مرتبہ پھر اپنے سرچشمۂ حیات (قرآن) کے نزدیک آ جائیگا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ کام ایک جماعت ہی کے کرنے کا ہے لیکن میں جماعتوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ اسلئے میں نے توفیقِ ایزدی کے بھروسے پر اس کام کو بھی از خود ہی شروع کر دیا ہے اور یہ سلسلہ بھی معارف القرآن کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس باب میں میں کس حد تک کامیاب ہو سکوں گا۔ نہ ہی میں اس چیز کو آغازِ سفر کے وقت دل میں آنے دیا کرتا ہوں۔ جب تک مجھ میں ہمت ہوگی اور زندگی وفا کریگی، میں ان کاموں کو کرتا جاؤں گا۔ جس مقام پر ہمت یا زندگی ختم ہو جائے گی، وہیں یہ بھی رک جائیں گے۔ اگر اس دوران میں اللہ کے بندوں کو خیال آ گیا اور اس طرح رفقائے کار کی کوئی جماعت پیدا ہو گئی تو میں یہ سب کچھ ان کے سپرد کر کے بطور ایک رفیقِ کاران کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری یہی متاعِ حیات، شاید کسی بعد میں آنے والے کے کام آ جائے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں غلطیوں کا بھی امکان ہے اور خامیوں کا بھی۔ لیکن میں نے کام کی ابتدا کر دی ہے۔ میرے دوسرے رفقائے کار (اگر مجھے میسر آ گئے تو) یا بعد میں آنے والے راہرو میری غلطیوں کو درست کر دینگے اور خامیوں کو پورا۔ اگر یہ سب کچھ اور کسی کا نام بھی آیا تو کم از کم میرے بعد انہی راستوں پر چلنے والے راہروؤں کو میرے نقوشِ قدم سے اتنی تسلی تو ہو جائیگی کہ اس راستہ سے پہلے بھی کوئی مسافر گذرا ہے اس لئے یہ راہ غیر مانوس (Unfrequented) نہیں۔ اتنی سی تسلی بظاہر کچھ قابلِ قدر دکھائی نہیں دیتی لیکن میں اس کی قیمت پہچانتا ہوں۔ اسلئے کہ مجھے یہ بھی میسر نہیں آ سکی۔

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں رفقائے کار کی تلاش یا فراہمی سے بے فکر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مقصد میں کامیابی کا راز "تزمیل" میں ہے۔ مجھے "زمیل" تو مل رہے ہیں، وسائلِ سفر نہیں مل رہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ جب وہ لوگ جن کے دل شوقِ شہادت سے لبریز ہیں، لیکن ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کیلئے نہ سواری ہے نہ روپیہ کہ جس سے سواری کا جانور خرید سکیں، تمہارے پاس (اے رسول) بایں مقصد آتے ہیں کہ ان کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے اور سواری کا انتظام تمہارے پاس بھی نہیں ہوتا تو ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا الا یجدوا ما ینفقون (۹/۹۲) وہ اس طرح واپس جاتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور دل اس حسرت سے غم آلود کہ ان کے پاس اتنا بھی نہیں جس سے جہاد میں شرکت کا سامان بہم پہنچا لیا جائے۔

لیکن ہمیں اس نامساعدتِ حالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ ہر تاریک رات ایک نورانی صبح کی تمہید ہوتی ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ توکلت والیہ انیب۔

پرویز